تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

نیلم احمد بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ میں شناختی بحران:

سیاسی و سماجی پس منظر میں

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

محقق

آمنہ بی بی

217-FLL/MSURDU/S17

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

IH23087

MS
891.4393
آم ن

اردو ادب - ناول

" " " تشریح و تنقید

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ آمنہ بی بی رجسٹریشن نمبر 217-FLL/MSURDU/S17 نے ایم۔ایس۔ اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"نیلم احمد بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ میں شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں"** رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

"جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔اور جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے"

سب سے پہلے ربِ کائنات کی ان کرم نوازیوں کی شکر گزار ہوں جس نے ہر مشکل گھڑی میں سر خرو کیا۔اللہ اور رسولؐ کے بعد اپنے والد کی شکر گزار ہوں جو اس دنیا میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہر پل میرے ساتھ رہتے ہیں مجھے تھکنے نہیں دیتے۔والدہ اور بہن بھائیوں کی خصوصی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں اور تعاون کے باعث تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور باخوبی تحقیقی مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

مقالے کے موضوع کا انتخاب چوں کہ ایک دشوار مرحلہ ہے اور اس مشکل مرحلے کی آسانی ان دو عظیم ہستوں ڈاکٹر نجیبہ عارف اور ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے باعث ممکن ہوئی میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔میں ناول پر کام کرنے کی خواہش رکھتی تھی اور الحمد اللہ میرے حصے میں جو تحقیقی آیا وہ ناول پر ہی تھا۔

اس مقالے کا موضوع "نیلم احمد بشیر کا ناول "طاؤس فقط رنگ" میں شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں" ہے۔مقالے کو چہار ابواب میں تو تقسیم کیا گیا ہے جن کی تفصیل یوں ہے۔

پہلا باب تارکین وطن اور شناختی بحران پر مشتمل ہے جس میں یورپ اور امریکہ میں ۱۱/۹ کے بعد عدم شناخت کا مسئلہ اور مسلمانوں کی زندگیوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں اردو ناول مین شناختی بحران بطور موضوع: اجمالی جائزہ لیا گیا ہے جن میں قرۃ العین حیدر کا ناول گردشِ رنگ چمن، عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں، بانو قدسیہ کا ناول حاصل گھاٹ مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی، خس و خاشاک زمانے، راکھ اور مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ شامل ہے

تیسرے باب میں ناول "طاؤس فقط رنگ" میں کرداروں کے زریعے شناختی بحران کو سیاسی و سماجی پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ناول کا فکری و موضوعی جائزہ لیتے ہوئے اس کے اسلوب اور تکنیکوں کے استعمال کو زیر بحث لایا گیا ہے۔آخر میں مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

ناول کی مصنفہ دور حاضر کی تخلیق کار ہیں۔میری یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق جو کہ سپر وائزر ہیں ان کے توسط سے مصنفہ نیلم احمد بشیر سے ملاقات ہوئی۔مصنفہ نے خوش اسوبی سے وقت دیا اور ناول سے متعلق جو جاننا چاہا مصنفہ نے تفصیل گفتگو کی۔اس کے لیے میں مصنفہ کی مشکور ہوں۔بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

شعبہ اردو کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس ناول پر کام کرنے کی اجازت دی۔

ڈاکٹر غلام فریدہ خصوصی شکریے کی مستحق ہیں جن کی بدولت کنٹونمنٹ لائبریری جانا ہوا اور مفید مواد حاصل ہوا۔ اس تحقیقی مقالے کے دوران خاصی مشکلات کا سامنا بھی رہا اس کی ایک وجہ تو سپروائزر کا دوسرے ملک جانا اور دوسری وجہ یہ ناول "طاؤس فقط رنگ" چوں کہ مصنفہ کا پہلا ناول ہے اس کے حوالے سے مواد کے حصول میں دشواری کا سامنا رہا۔ خیر وہ منزل ہی کیا جس کے حصول کے لیے دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مقالے کا موضوع نیلم احمد بشیر کا ناول "طاؤس فقط رنگ" میں شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں" ہے۔ شناختی بحران اور خاص طور پر گیارہ ستمبر کے بعد شناختی بحران کے حوالے سے انگریزی ریسرچ آرٹیکل سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

موضوع کے انتخاب کی مشکل حل ہوئی یعنی منزل کا تعین ہوا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے بہت سارے مراحل طے کرنے تھے منزل کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے اور اسے کیسے طے کرنا ہے اس راستے کی دشواری میں راہنمائی کرنے والی سب سے پہلی شخصیت محترم خالد محمود صاحب ہیں جو کہ شعبہ اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی قیمتی وقت سے ہمیشہ میرے لیے وقت نکالا اور راہنمائی کی۔

اردو ادب سے تعلق رکھنے والی دوسری اہم شخصیت محمد اعجاز صاحب ہے جنھوں نے دوران تحقیق نہ صرف راہنمائی کی بلکہ اپنی ذاتی کتب بھی مطالعے کے لیے دیں۔ ان کتابوں کے بارے میں بتایا جو میرے تحقیقی مقالے کے لیے بہت مفید تھی۔ اس راہنمائی کے لیے میں تاحیات آپ کی شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر نائید قمر صاحبہ کا خصوصی شکریہ جنھوں نے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اور اپنی کتب دیں آپ کے اس خلوص کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

خصوصی شکریہ رضوان مسعود، قمر عباس علوی، صبیحہ راؤف، علی جواد، ماریہ بتول، مریم جمیل۔ محمد ناصر، ثناء رشید، محمد امان اللہ، ملک محمد اسلم اعوان صاحب جنھوں نے مختلف شہروں سے کتب اور مقالات مجھے ارسال کیے جہاں جانا میرے لیے مشکل تھا۔

ممنون ہوں مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات، نیشنل لائبریری، نشنل بک فاؤنڈیشن، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کی لائبریری، نمل یونیورسٹی کی لائبریری، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کی لائبریری، کنٹونمنٹ لائبریری بل ہاؤسز میں موجود نگران جو کتب کی تلاش میں معاون ثابت ہوئے۔

آمنہ بی بی

۵ فروری ۲۰۲۰ء

Rupees 20 — ۲۰ روپیہ

بیان حلفی

میں مسماۃ آمنہ بی بی دختر نثار احمد رجسٹریشن نمبر 217-FLL/MSURDU/S17:

حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ میرا مقالہ بعنوان "نیلم احمد بشیر کے ناول

طاؤس فقط رنگ میں شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں"

سرقے سے پاک ہے۔ میرے علم و یقین کے مطابق درست ہے

اور کوئی امر مخفی نہیں رکھا گیا ہے۔

مقالہ نگار

آمنہ بی بی

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	تارکینِ وطن اور شناخت کا بحران	۱
	الف۔ امریکہ میں نائن الیون کے بعد عدم شناخت کا مسئلہ	
	ب۔ مسلمانوں کی زندگیوں پر ان کے اثرات	
۲۔	**باب دوم:**	
	منتخب اردو ناولوں میں شناختی بحران بطور موضوع: اجمالی جائزہ	۲۹
۳۔	**باب سوم:**	
	طاؤس فقط رنگ میں کرداروں کے زریعے شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں	۶۰
۴۔	**باب چہارم:**	
	طاؤس فقط رنگ کا موضوعی و فکری جائزہ	۹۱
	مجموعی جائزہ	۱۲۱
	کتابیات	۱۲۸

باب اوّل

تارکینِ وطن اور شناخت کا بحران

باب اوّل:

نیلم احمد بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ میں شناختی بحران: سیاسی و سماجی پس منظر میں

شناختی بحران کے لفظی و اصطلاحی معنی:

فیروز اللغات کے مطابق:

شناخت: "پہچان، تمیز، شناسائی، واقفیت"

"بحران: تعطل، بیماری کا زور"[1]

فرہنگ تلفظ کے مطابق:

شناخت: "معرفت، پہچان، پرکھ"

بحران: "شدید صورت حال، توڑ کا وقت"[2]

آکسفورڈ: انگلش سے اردو ڈکشنری: شناختی بحران:

Identity Crisis : a feeling of being uncertain about who or what you are

ایسی حالت جب کوئی فرد معاشرے کے ساتھ اپنے تعلقات کو نئے سرے سے متعین کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔[3]

مختلف انٹرنیٹ ویب سائٹ کے مطابق شناخت اور بحران کی تعریفیں:

"کسی فرد کی انفرادی شخصیت۔"[4]

"بیان کی ہوئی کسی چیز کے ساتھ ہونے کی شرط۔"[5]

"وہ شخص جس کے بارے میں کہا جارہا ہے اس کی حقیقت۔"[6]

"کوئی فرد یا شخص کسی چیز کا تعین کرتا ہے وہ اس کی شناخت۔"[7]

"کوئی چیز یا شخص کیا ہے اور کیسا ہے۔"[۸]

"وہ خصوصیات، جذبات یا عقائد جو ایک شخص کو دوسرے سے تفریق کرتے ہیں۔"[۹]

بحران: "مصائب، قدرتی آفات، بحران ایسی صورت حال ہے جس میں کوئی چیز یا کوئی شخص سنجیدہ مسائل سے متاثر ہوتا ہے۔"[۱۰]

"بہت سارے مسائل کی موجودگی میں انتہائی مشکل اور خطرناک صورت حال مثلاً سماجی بحران، سیاسی بحران، معاشی اقتصادی، ثقافتی بحران۔"[۱۱]

"غیر مستحکم یا خطرے کی حالت کا بحران۔"[۱۲]

وکی پیڈیا کے مطابق شناختی بحران:

"ایسی حالت جس میں ایک شخص اپنے ہونے کے بارے میں پر یقین نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور اس کا کیا کردار ہے۔"[۱۳]

"کسی ادارے یا تنظیم میں اس کی نوعیت یا سمت کے بارے میں الجھن کی کیفیت بحران کہلاتا ہے"[۱۴]

اپنے احساسات کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت۔[۱۵]

امریکہ کے ماہر نفسیات ایرک ایرکسن کے مطابق شناختی بحران کے مسائل کسی مخصوص عمر تک محدود نہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تغیر کا عمل تشکیل پاتا ہے۔ خاص طور پر نوجوانی کا عہد انسانی زندگی میں شناخت کے لیے سب سے اہم دور ہے۔ زندگی میں در پیش انسانی شناخت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایرکسن نے شناختی بحران سے متعلق کچھ سوالات اٹھائے ہیں:

۱۔ کیا آپ کو زندگی میں اپنے کردار کا یقین ہے؟

۲۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی حقیقت نہیں معلوم؟ مثلاً (عدم شناخت کا شکار ہونا)

۳۔ انسان کی ترقی میں شناختی بحران رکاوٹ بنتا ہے۔ مثلاً جب انسان کو یہ نہیں معلوم ہو گا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اس کا اصل کیا ہے۔ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، اس کی شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی اور انسان خود کی شناخت کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔

۴۔ شناختی تشکیل اور شناختی بحران دونوں معاشی و نفسیاتی دائرے میں شامل ہیں۔

ایرکسن نے شناخت کے تصور کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

> "Erikson presents the idea of identity as being relative to another group and that a stranger identity develops when the weaker group is emancipated from the identity of the dominant group or community and that identity answers the question " who am I"?
>
> ایرکسن نے شناخت کے تصور کی وضاحت کے لئے دو متعلقہ طبقے بنائے ہیں ۔ایک مضبوط گروپ جو غالب اور طاقت ور ہے، جو اپنی شناخت رکھتا ہے۔
>
> دوسرا طبقہ وہ ہے جو کمزور ہے جسے برابری کے حقوق میسر نہیں ہوتے ۔طاقت ور طبقہ اپنے اختیارات اور اپنی حیثیت اور شناخت کے باعث کمزوراور محروم طبقے کا استحصال کرتا ہے ان کی اصل پہچان ان سے چھین جاتی ہے جب وہ غالب طبقے سے نجات چاہتا ہے تو اس کے ذہن میں شناخت سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "میں کون ہوں" [16]

ایرکسن کا یہ کام یا نظریہ شناختی بحران کا تجزیہ پیش کرنے کے لئے بنیادی نقطہ تشکیل دیتا ہے۔کسی شخص میں پائی جانے والی وہ خصوصیت جو اسے دوسروں سے الگ پہچان عطا کریں اس کے مذہبی عقائد، جغرافیہ، زبان، رنگ، نسل، لباس، طرز معاش، تہذیب و ثقافت، تاریخ وغیرہ اسے شناخت سے منسلک کرتے ہیں۔شناخت کسی انسان کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ کون ہے؟اس کا تعلق کہاں سے ہے؟اس کا رہن سہن رسم ورواج کیا ہیں۔جب ایک شخص ایک معاشرے سے نکل کر دوسرے معاشرے میں جاتا ہے تو وہاں پر اسے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بحران ہے۔

شناخت کا سب سے مناسب اور متوازن اہم پہلو اپنی ذات کو مستقل وجود کے طور پر منوانا ہے۔اپنی پہچان رکھنا ہے۔ آپ کی اپنی انفرادی شناخت بغیر کسی دوسرے وجود کے اپنی حقیقت رکھتی ہو لیکن اس بات کا مطلب یہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے وجود کے تشخص کے لیے دوسروں سے اور ان کی روایات و اقدار سے نفرت کریں۔ کیونکہ جب کسی معاشرے میں نفرتیں جنم لیتی ہیں تو وہ معاشرے مساوات قائم نہیں کرسکتے۔عدم مساوات کا شکار ہو کر ظلم و بربریت، ناانصافی، دوسروں کے حقوق کا استحصال، غیر انسانی سلوک قتل و غارت اور دہشت گردی جیسے عزائم پیدا ہوتے ہیں جن کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہے۔اور یہ عزائم معاشرے کو مزید تاریکی کی طرف دھکیلتے ہیں ۔اس وجہ سے انسان اخلاقی اقدار کو فراموش کرکے اپنے وجود کی بقاء چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے خطرہ ثابت ہوتا ہے۔ایسے ہی جس معاشرے میں، جس ملک میں، طاقت ور اقوام غالب ہوتی ہیں وہ کمزور اقوام کو مزید کمزور کرکے اپنا غلام بناتی ہیں۔ان کی تاریخ کو مسخ کرکے انہیں بے نشان اور بے شناخت کرتی ہیں۔

انسان کی پہچان (شناخت) کا تعلق اس کے موجودہ دور (حال) کے ساتھ ماضی کی روایات، اقدار، تاریخ، تہذیب و ثقافتی عناصر سے جڑا ہوتا ہے ان سے اس کی شناخت منسلک ہوتی ہے اس کی اصل بنیاد سے وابستہ ہے، ان اقدار کو زندہ رکھنا ان سے جڑے رہنا کسی بھی انسان کی شناختی بقاء کی ضمانت ہے۔ انسان ماضی کے مسخ شدہ حقائق کو زندہ رکھتا ہے تو وہ اس کی شناخت کو اجاگر کرتے ہیں۔

اگر نو آبادیاتی عہد کے بعد دیکھا جائے تو سامراجیت کے اثرات آج بھی موجودہ معاشروں میں نظر آتے ہیں۔ رنگ و نسل کا تعصب، طاقت ور کی کمزور پر حاکمیت، مذہبی اختلافات، بنیادی حقوق کا استحصال رنگ و نسل کے باعث گوروں کو سیاہ فام پر فوقیت دینا، ایسے بہت سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں جو لوگوں سے ان کی شناخت چھین رہے ہیں۔ جیسے طاقت ور اقوام جہاں قابض ہوتی ہیں وہاں کے انتظامات کو اپنے کنٹرول میں کر لیتی ہیں۔ نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی طور پر بھی قابض ہو کر اپنی خود کار شناختیں ان پر مسلط کرتی ہیں ان کی تعلیمی نصاب سازی بھی وہ اپنے مطابق کرتے ہیں تاکہ وہ ان کی سوچ بھی اپنے مطابق پیدا کریں۔

لیکن اب یہ شناختی مسائل صرف نو آبادیات یا مابعد نو آبادیات تک محدود نہیں بلکہ عالمگیری مسائل ہیں۔ پوری دنیا ایک گلوبل ولیج (Global Village) بن چکی ہے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ انسانی ذہن نے ترقی کی اور سائنسی ایجادات ہوئیں جن کی بدولت پوری دنیا گلوبلائزیشن بن چکی ہے جسے اردو میں عالمگیریت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کے ذریعے سے ایک ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اقدار دوسرے ممالک تک پہنچتے ہیں۔ جیسے جیسے عالمگیریت کا پھیلاؤ ہو رہا ہے دنیا سمٹ کر ایک دوسرے میں سما گئی ہے لیکن شناختی بحران کی لکیر مشرق و مغرب کے درمیان بلکہ ملک کے اندر بھی یہ تقسیم شناختی مسائل کو جنم دیتی ہے۔ ایک ہی ملک کے اندر بسنے والوں کے درمیان رنگ، نسل کے امتیازات، فرقہ واریت، شدت پسندی اور تعصب کو فروغ ملا تہذیبی و ثقافتی، لسانی، سیاسی مسائل فرد کی شناخت پر بدنما داغ اور سوالیہ نشان ہیں۔ جو کسی غیر ملک میں تارکین وطن سے زیادہ خطرناک صورت حال ہے جب اپنے ہی ملک میں صوبائی اور علاقائی سطح پر انسان شناختی بحران کا شکار ہو جائے۔

دور حاضر میں انسانوں کو پیش آنے والے واقعات، تاریخی حقائق، انسان کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کی ضروریات، خواہشات و احساسات، مختلف تہذیبوں کے درمیان پائے جانے والے تصادم، سیاسی سماجی صورتحال، سرحدی و جغرافیائی محرکات اور ایسے بہت سے چھوٹے بڑے عناصر یکجا ہو کر شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی شناخت کوئی ایسی جامد شے نہیں ہوتی کہ جس میں تغیر کا عمل ممکن نہ ہو کئی ایسے مواقع آتے ہیں جو

انسان کی شناخت کو مختلف پیش کرتے ہیں۔ جیسے کہ سکول میں کوئی استاد ہے یہ اس کی پہچان اس کے پیشے کے لحاظ سے ہے۔ جس علاقے سے اس کا تعلق ہے اس شناخت کا تعلق جغرافیے سے ہے۔ ایک جگہ بطور پاکستانی شناخت، بطور پنجابی شناخت، مذاہب سے منسلک نسل سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اکثر شناخت پر جو اس کے والدین کے خیالات و عقائد پر مبنی ہوتی ہے بعض اوقات بچہ بڑا ہو کر اس شناخت پر جو اس کے والدین نے اس کو عطا کی ہے اس پر سوالات اٹھاتا ہے جب اس سے وہ شناخت چھن جاتی ہے تو اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ اب کیا کرے۔

شناختوں کا تعلق ایک مربوط نظامِ حیات سے ہوتا ہے۔ جس میں شناخت کے مختلف پیمانے ہیں جن کی بنیادوں پر کسی فرد کو اس کی شناخت سے منسلک کیا جاتا ہے۔ کہیں شناخت فرد کی ذات سے منسلک ہے کہیں مذہب، کہیں فرقے، خطے رنگ و نسل زبان و لباس اور کہیں سماج سے منسلک ہے۔ لیکن ان پہلوؤں سے متاثر انسان کی ذات ہی ہوتی ہے کہ میں کون ہوں؟ ہم کیوں ہیں؟ یہ ہر فرد کی شناخت ہے۔ اور جب کسی فرد کو اسی سوال کے جواب میں الجھن ہو بے یقینی کی کیفیت ہو کہ میں کون ہوں؟ میری اس معاشرے میں کیا حیثیت ہے۔ اس کے جواب میں وہ کشمکش کا شکار ہو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھے اس معاشرے میں جہاں وہ قیام پزیر ہو۔ اپنی شناخت سے آگاہ نہ ہونا اسے شناختی بحران میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جو انسان کسی معاشرے میں اس سوال سے مطمئن ہے وہ اس کے جواب سے واقف ہے وہ معاشرے میں اپنی شناخت کے بارے میں پُراعتماد ہوتا ہے وہ کسی کشمکش یا الجھن سے دوچار نہیں ہوتا۔

شناختی بحران کا سامنا:

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بحران کیا ہوتا ہے بحران کسے کہتے ہیں اور کن صورتوں میں انسان کو شناختی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کوئی فرد ایک معاشرے سے نکل کر دوسرے معاشرے میں جاتا ہے وہاں جو مسائل اسے زندگی گزارتے ہوئے درپیش ہوتے ہیں وہ بحران ہے۔ بحران مختلف نوعیتوں کا ہوتا ہے یعنی ایک کمیونٹی سے دوسری کمیونٹی میں جانے والے تارکین وطن کو مختلف طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں جانے والوں کے لیے نئے معاشرے میں طرزِ معاشرت کا تضاد بہت سارے مسائل پیدا کرتا ہے رہنا، سہنا اوڑھنا، طرزِ معاشرت کا تضاد، عقائد، نظریات سب مختلف ہوتے ہیں۔ سماجی اقدار میں فرق ان کے درمیان دوریاں پیدا کرتا ہے مشرق و مغرب کا خاندانی نظامِ زندگی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ مشرق میں جس قول و فعل کی اجازت قانون، معاشرہ یا مذہب نہیں دیتا جسے وہ غیر مناسب سمجھتا ہے وہ ممکن ہے مغربی طرزِ معاشرت اور سماجی اقدار کے نزدیک قابل قبول عمل ہو۔ دونوں کے ہاں آزادی کا

تصور مختلف ہے اس لیے تارکین خود کو دوسرے معاشرے میں مس فٹ محسوس کرتے ہیں اور شناختی بحران کا شکار ہوتے ہیں پھر وہ اپنی شناخت کی تلاش میں بھٹکتے ہیں۔ دوسرا معاشرہ اور اس کے سماجی و معاشی اقدار اور مذہبی و سیاسی نظریات ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کو وہ شناخت عطا نہیں کرتے بلکہ وہ الجھن کا شکار ہو کر تشخص کی بقاء کے لیے گمنامی میں شناخت کی تلاش کے لیے سرگرداں عمل رہتے ہیں۔

کمیونسٹ دنیا کے خاتمے کے بعد سرد جنگ اور سرد جنگ کے بعد پوری دنیا میں بسنے والی قوموں کے درمیان صرف سیاسی، سماجی معاشی یا نظریاتی امتیازات ہی نہیں پیدا ہوئے ہیں بلکہ ثقافتی امتیازات کی نوعیت نے بھی جنم لیا ہے جس کے باعث کسی فرد کی شناخت کا حوالہ مذہب، تاریخ، تہذیب و ثقافت، جغرافیہ، زبان و اقدار و روایات، آباؤ اجداد وغیرہ سے منسوب ہوا۔ بقول سہیل انجم:

> دنیا میں اقوام کے درمیان اہم ترین امتیازات نظریاتی، سیاسی و معاشی نہیں بلکہ ثقافتی ہیں۔ اقوام اور ملتیں اس سے بنیادی سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہی ہیں جو انسان کو درپیش ہو سکتا ہے۔ ہم کون ہیں؟[۱۷]

مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان پیدا کردہ تضادات ان معاشروں میں قیام پذیر باشندوں کو اس سوال کا احساس دلاتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ ہماری شناخت کیا ہے۔ کئی ہماری اپنی شناخت دوسری طاقت ور شناختوں کے زیرِ سایہ تو نہیں آ گئیں؟ ہماری انفرادیت قائم ہے یا نہیں؟۔ بدلتے ہوئے وقت و حالات کے ساتھ دنیا میں مختلف سطحوں پر تبدیلیاں مرتب ہوئیں ہیں جنھوں نے انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانوں کو بلاواسطہ یا بلواسطہ طور پر متاثر کیا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بعد دنیا کی تاریخ میں متعدد تبدیلیاں مرتب ہوئی ہیں اور بیسویں صدی میں بھی اقوام کے درمیان دیگر کئی تنازعات سامنے آئے ہیں خاص طور پر جنگِ عظیم اول اور دوم کے بعد لوگوں میں نسلی امتیازات، مختلف ریاستوں کے درمیان تصادم، تہذیبی و ثقافتی کشمکش اور مذہبی عقائد کو بنیاد بناتے ہوئے شدت پسندی کو فروغ دیا گیا ہے۔ شناخت کے مسئلے کو شدت پسندی نے ابھارتے ہوئے نیا رنگ دیا ہے۔ شناخت کا مسئلہ ابتداء ہی سے کہیں نہ کہیں کسی سطح پر موجود تھا لیکن اسے ثانوی درجہ حاصل تھا۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے اور اکیسویں صدی کے آغاز میں شناخت کے مسئلے نے زیادہ سر اٹھایا ہے اور شدت کے ساتھ پوری دنیا کو متاثر کیا۔ بقول عامر رانا:

> لبرل جمہوری قومی ریاستوں کے قیام اور استحکام کے بعد دنیا میں شناخت کا مسئلہ ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مگر سرد جنگ کے اختتام اور اکیسویں صدی کی شروعات سے گلوبلائزیشن کے تیز رفتار

عمل سے پے در پے کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس نے پوری دنیا کے امن اور معیشت کے سنجیدہ مسائل پیدا کر دیئے اور شناخت کا مسئلہ بھی ایک بار پھر اٹھایا جانے لگا۔[18]

عالمگیریت نے جہاں پوری دنیا کو سمیٹ کر گلوبل ولج بنا دیا ہے اور آپس کے فاصلوں کو ختم کیا وہاں بہت سارے مسائل بھی جنم دیا ہے۔ جب مختلف اقوام نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے اور ایک دوسرے کے سیاسی، سماجی، معاشی معاشرتی حالات و واقعات سے آگاہی کا راستہ ہموار کیا ہے ایک دوسرے کے اندرونی و بیرونی معاملات تک با آسانی رسائی حاصل کرنے لگے ہیں۔ جس سے انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ طاقت ور نے کمزور کی ریاست پر قابض ہونے کے لیے سازشیں اور منصوبہ بندیاں کیں اور وہ اپنے ان مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں اور پھر کمزور ملک کی معیشت اور نظام فکر کو متاثر کیا ہے جس سے ملکی امن و امان نہیں رہتا بلکہ دہشت گردی کے واقعات پیش آتے ہیں۔ تہذیبی و ثقافتی تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا دو تہذیبوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ یعنی ایک کو مغرب اور دوسری غیر مغربی کہا جاتا ہے۔۔ اس طرح ان میں احساس برتری اور احساس کمتری کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ بقول سیموئل پی ہنٹنگٹن:

یورپی انسانی تاریخ ہی میں لوگ، لوگوں میں ہم، ہمارا گروہ اور دوسرا گروہ، ہماری تہذیب اور غیر مہذب کے خانوں میں بٹ گئے ہیں۔[19]

دوسری اقوام عدم تحفظ کا شکار ہوئیں اسی احساس کمتری میں انہیں شناختی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ شناخت کا تعلق مختلف عناصر سے ہے مثلاً

مذہب

تہذیب و ثقافت

زبان

رنگ و نسل (خاندان)

جغرافیہ

تاریخ

روایات و اقدار

لباس

ایک سماج کے اندر رہتے ہوئے انسان کی سماجی شناخت اس کے کردار اور پیشے سے ہوتی ہے۔

کردار:

کوئی شخص کسی خاص طرح کے حالات وواقعات کے تناظر میں جو رویہ یا طریقہ کار اختیار کرتا ہے یا ہم کسی انسان سے کسی خاص مخصوص حالات وواقعات کے نتیجے میں اس سے یہ امید کرتے ہیں کہ اس کا ردِ عمل یقیناً ایسا ہوگا وہ کسی انسان کی کرداری شناخت ہوتی ہے

پیشہ:

کسی معاشرے میں بستے ہوئے کوئی انسان جو پیشہ اختیار کرتا ہے سماجی سطح پر وہ اس کی پہچان ہوتی ہے۔

مذہب:

مذہب کا واسطہ براہ راست انسان کی زندگی سے ہے۔ انسان کسی نہ کسی طرح مذہب سے منسلک ہوتا ہے۔ مذہب کے حوالے سے شناختی مسائل ایک ملک کے باشندوں کو دوسرے ملک میں رہنے سے بھی پیش آتے ہیں اور اپنے ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقہ واریت کے باعث شناختی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

غیر ملک میں مذہبی مسائل شناختی مسائل کی بنیاد

اپنے ملک میں مختلف فرقہ واریت کے باعث شناختی مسائل:

علمی سطح پر دیکھیں تو مختلف ممالک میں اقلیتوں کو مختلف مذاہب کی وجہ سے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے کیوں کہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر ایک دوسروں کے لیے نفرت پیدا کی گئی ہے اس وجہ سے انہیں روزگار کے مواقع ملنے میں بھی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور ان کی شناخت وہاں غیر "Others" کی ہوتی ہے کیونکہ مذہب کی وجہ سے تعصب اور تنقید کا نشانہ اقلیتوں کو بنایا جاتا ہے۔ ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اس ملک کے مقامی باشندے اور حکومت اقلیتوں یا تارکین وطن کے مذہب اور نظریات وعقائد کو برداشت نہیں کرتے ہیں جیسے امریکہ میں مسلمان تارکین وطن اور مسلم مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی اداروں کو جانی ومالی نقصان پہنچایا جاتا ہے جس سے وہ لوگ وہاں عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہیں ان کی شناخت محفوظ نہیں رہتی مسجد پر حملہ، چرچ پر حملہ، مندر پر حملہ اور مختلف عبادت گاہوں کا استحصال یہ سب حادثات اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ بقول شفیق منصور:

ملک میں شناخت کے بحران کی موجودگی سے متعلق مذہبی طبقے کے افراد کا ماننا ہے کہ واقعتاً ملک میں

شناخت کا بحران پایا جاتا ہے۔۔۔فرقہ واریت نے بھی سماج میں شناخت کے مسائل پیدا کیے ہیں۔ اس نے سماج میں ایک ہی مذہب کے مختلف مکاتبِ فکر کو تو تقسیم کیا ہی لیکن شناخت کے خلاف مفادانہ شدت پیدا کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔[۲۰]

وہ آزادانہ بے خوف و خطر اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی نہیں کر سکتے اس میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ افراد اپنے حقوق کے حصول کے لئے تشدد کا راستہ اپنا لیتے ہیں اور کچھ بے زبان بن کر بے شناختی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوسری سطح پر دیکھیں تو ایک ہی ملک کے اندر ایک مذہب سے وابستہ لوگوں میں بھی فرقہ واریت کے ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو لوگوں میں شناخت کے حوالے سے کشمکش اور تصادم پیدا کرتے ہیں۔ جیسے کہ پاکستان میں مذہب دین و اسلام سے تعلق رکھنے والے لوگ فرقہ واریت میں مبتلا ہیں جیسے شیعہ، سنی، دیوبندی، اہل حدیث وغیرہ کی صورت شناخت کا مسئلہ جنم لیتا ہے۔

تہذیب و ثقافت:

دنیا کے ہر معاشرے کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے اور بنیادی طور پر دیکھیں تو کسی معاشرے کو شناخت بخشنے میں تہذیب و ثقافت کا نمایاں کردار ہوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کی بدولت ہر ملک اپنی الگ شناخت قائم کرتا ہے جو اسے دوسری اقوام کی شناختوں سے منفرد بناتی ہے۔ ثقافت کسی قوم کے ان عقائد و روایات اور طور طریقوں کی ترجمان ہوتی ہے جو وہ اپناتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنا وجود تسلیم کرواتے ہیں۔ کوئی بھی قوم معاشی، سیاسی اعتبار سے کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو جائے لیکن جب تک اس کی ثقافت محفوظ نہیں اس قوم کی شناخت دھند میں لپٹی اس لاش کی مانند ہوتی ہے جس کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادیں کمزور اور کھوکھلی ہو جاتی ہیں جو کسی بھی وقت فلک بوس ہو سکتی ہے۔ معاشرے کی بقاء اس کے ثقافتی ورثے پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت کسی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ بقول ایس ایم شاہد:

> دنیا میں ہر ایک معاشرہ ایک ثقافت رکھتا ہے کیونکہ ثقافت کسی بھی معاشرے کے افراد کی راہ عمل ہے۔ اس راہ عمل میں اقدار، عقائد، رسم و رواج اور معمولات شامل ہیں۔ ثقافت ہی کی بدولت معاشرے دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔[۲۱]

کسی بھی ملک کی ثقافت اسے پہچان عطا کرتی ہے اور ہر ملک کی ثقافت مختلف ہوتی ہے اور مختلف اقوام کے مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جب ایک خطے میں ایک ساتھ رہتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ربط کے لیے آپس میں میل جول کرنا ہوتا ہے اس میل جول میں کہیں وہ ایک دوسرے کی ثقافتوں سے اثر قبول کر

لیتے ہیں اور کہیں بہت سارے عوامل سے اختلاف پیدا ہوتا ہے اس ثقافت کو نہیں اپنا سکتے ہیں وہ ان کے عقائد یا روایات کے منافی ہوتے ہیں۔ تب وہ اس معاشرے میں اس تہذیب و ثقافت میں خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ نے جس تہذیب و ثقافت کو جنم دیا وہ مادر پدر آزادی کا تصور ہے۔ عریانیت ہے اب کسی دوسری ثقافت بطور خاص مسلم ثقافت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اس ثقافت کو مکمل طور پر اپنانا مشکل ہے کیونکہ یہ اس کی ثقافت کا حصہ نہیں۔ اور اگر وہ اس ثقافت کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے آئینے میں نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ جن اقوام نے اپنی ثقافت کو پس پشت ڈال کر دوسری اقوام کی اندھی تقلید کی ہے وہ غلامی و محکومی کا شکار ہوئی ہیں۔ بقول: ڈاکٹر نصیر احمد نصیر:

> جن قوموں نے اپنی ثقافت سے انحراف کیا ان کا نتیجہ ان کی پسماندگی و کمزوری، غلامی و محکومی، ذلت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی کی صورت میں نکلا۔ [۲۲]

مختلف تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان میں اکثر عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ جسے وہ سمجھ نہیں پاتے اور ان کے نزدیک دوسری تہذیب و ثقافت عجیب و غریب ہے کیوں ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ دوسری اقوام جہاں غیر اقوام پر قابض ہو جاتی ہیں وہ مقامی باشندوں کی ثقافت کو متاثر کر کے بناتی ہیں جیسے یورپ اور امریکہ نے دوسری اقوام جنوبی افریقہ، نیوزی لینڈ دیگر اقوام وغیرہ پر قابض ہو کر ان کی شناخت چھین لی۔ طاقت ور اور کمزور کے درمیان یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری ہے۔

رنگ و نسل:

انسان کسی بھی عہد اور کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو اس کا رنگ اس کی نسل اس کو دوسروں سے منفرد بناتی ہے اس کو الگ شناخت عطا کرتی ہے۔ رنگ و نسل کے امتیاز کو بنیاد بنا کر ہمیشہ اہل یورپ و امریکہ نے اپنی سفید رنگت اور نسل کو دوسروں سے افضل سمجھا ہے۔ اور خاص طور پر سیاہ رنگت والے افریقہ سے تعلق رکھنے والوں کو کمزور اور حقیر جانا۔ انہیں غلام بنا کر ان کی شناخت کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔ افراد اور قوموں کو شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ بقول: سیموئل پی ہنٹنگٹن:

> اب افراد اور قومیں انسانوں کے سامنے آسکنے والے سب سے بنیادی مسئلے کا حل تلاش کر رہی ہیں کہ ہم کون ہیں۔ [۲۳]

نسل پرستی اور رنگ کی بنیاد پر منفی جذبات کسی نہ کسی صورت میں قوموں میں پائے جاتے تھے۔ نسل پرستی کی وجہ سے دوسری قوموں سے خود کو بہتر جانتے ہوئے ان اقوام کو مزید کمزور کیا گیا تاکہ نسلی برتری قائم رہے اور

دوسری قوم اپنی شناخت قائم نہ کر سکے۔ بر صغیر پاک وہند میں جب مغرب والوں نے قدم جمائے تو اپنی تہذیب و ثقافت ساتھ لائے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے ان کو غیر مہذب قرار دیا اور اپنی تہذیب و ثقافت ان پر لاگو کرنے کی کوشش کی تاکہ لوگ اپنے اصل سے کٹ جائیں ان سے ان کا شاندار ماضی چھین کر غلام بنائیں اپنی نسل اور سفید رنگت کے سامنے دوسری نسل سے تعلق رکھنے والوں کی شناخت کو تسلیم نہیں کیا۔ اور انھیں زبان، رنگ، لباس، تہذیب وغیرہ کے زریعے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ مغرب نے افریقہ کے غلاموں کو جب اپنے ساتھ لایا سب سے پہلے انہیں عیسائی بنایا مذہبی حوالے سے انہیں بے شناخت کیا۔ اور خود کی عطاکردہ شناخت دی آہستہ آہستہ ان میں عدم تحفظ کا احساس بیدار ہوا اور احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔ تہذیب و ثقافت کسی فرد اور معاشرے کی مشترکہ اقدار، ان کے رسم و رواج، مذہبی، لسانی جغرافیائی ضرورتوں کے پیش نظر انہیں انفرادی شناخت عطا ہوتی ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا نقطۂ نظر، روایات اور اقدار ہوتے ہیں جو اسے کسی دوسری تہذیب سے انفرادیت اور شناخت عطا کرتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں کے تصادم سے شناخت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

زبان:

جس طرح تہذیب و ثقافت، جغرافیہ، لباس، رنگ و نسل، مذہب کسی فرد کو شناخت کرتا ہے اسی طرح لسانی حوالہ بھی اسے دوسروں سے منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ جب تارکین اپنی زبان بولتے ہوئے احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور دوسری زبانوں کو اپنی زبان پر ترجیح دیتے ہیں وہ خود ہی اپنی زبان کی ناقدروی کر کے اپنی لسانی شناخت کھو دیتے ہیں۔

شناختی بحران در حقیقت کسی انسان کی اپنی ذات کی شناخت کے لئے در پیش مسائل ہوتے ہیں۔ سب سے بنیادی شناختی بحران میں فرد کی انفرادیت کا تعلق ہے۔ کوئی انسان کون ہے؟ کیسا ہے؟ اس کی اپنی ذات کی پہچان اور کیا مقام حاصل ہے وہ خود کے بارے میں کتنا جانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا انسان کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کے بارے میں جانتا ہو معاشرے میں اپنے کردار کے بارے میں جانتا ہو۔ انفرادی طور پر اگر انسان اپنی ذات سے بیگانہ رہتا ہے تو اس کا تعلق سماج کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ سماجی سطح پر شناختی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ معاشرے میں اس کا کردار کیسا ہے اور یہ کردار منفی ہے یا مثبت ہے؟ شناخت میں وقت کے ساتھ مثبت یا منفی تبدیلیوں کا امکاں ہر طور رہتا ہے۔ شناخت کا تعلق داخل اور خارج یعنی انفرادی اور اجتماعیت دونوں سے ہے۔ رنگ و نسل، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، لباس، اقدار تمام اقوام کو دوسروں

سے مختلف شناخت دیتی ہے۔ الگ شناخت کوئی ایسا قابل مذمت عمل نہیں کہ دوسروں سے نفرت کی جائے کہ وہ ہم جیسے نہیں ان کا طرز معاش ہم سے مختلف ہے۔

انسان مختلف خطوں میں بستے ہیں ان کی زبانیں مختلف ہیں ایک دوسرے سے، رنگ و نسل کا امتیاز موجود ہے، لباس، غذا کھانے پینے کا طریقہ کار ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ایک ہی شے کو پکانے کے لیے مختلف خطوں میں مختلف ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک مخصوص خطے کی اقوام کا طریقہ کار ٹھیک ہے اور دوسروں کا غلط ہے انھیں رد کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تو مختلف طرز معاشرت کا فرق ہے، شناخت کا فرق ہے جو انہیں ایک دوسرے سے منفرد کرتا ہے۔

انسان تخلیق کے ساتھ ہی اپنے وجود کی بقاء کے لیے شناخت کا متلاشی رہا ہے۔ اپنے آپ کو جاننا پہچاننا، وہ کیا پسند کرتا ہے اور کیا ناپسند؟ اس کے لیے بہتر کیا ہے؟ اسے معاشرے میں کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے جس سے اس کی شناخت متاثر نہ ہو۔ ابتداء میں انسان خود کو جاننا چاہتا ہے آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ انسان داخل سے خارج تک کا سفر طے کرتا ہے وہ اپنی ذات سے نکل کر گردونواح میں جھانکتا ہے۔ کیونکہ انسان اکیلے ساری دنیا سے کنارہ کشی کر کے نہیں رہ سکتا اسے زندگی گزارنے کے لئے معاشرے میں موجود افراد سے تعلق بنانا پڑتا ہے۔ اور اس تعلق کو بہتر طور پر استوار کرنے کے لئے معاشرے میں موجود افراد سے تعلق بنانا پڑتا ہے اور اس تعلق کو بہتر طور پر استوار کرنے کے لئے معاشرے میں موجود افراد سے تعلق بنانا پڑتا ہے اور اس تعلق کو بہتر طور پر استوار کرنے کے لیے اسے دوسروں کے صرف جسمانی خدوخال ہی نہیں طرز معاشرت کے بارے میں بھی جاننا پڑتا ہے۔ ان اقدار و محرکات کو سمجھنا ہوتا ہے جو اس کی شناخت کو تشکیل دیتے ہیں۔ وہ لوگ کون ہیں کیسے ہیں ان کا رہن سہن تہذیب و ثقافت کیا ہے وہ کون سی زبانیں بولتے ہیں کیسا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ ان کی عادات و اطوار کیا ہیں عقائد و نظریات کیسے ہیں؟ کس نسل اور مذہب کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کی حرکات کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے ان میں بہت زیادہ اختلاف اسے ان میں میل جول رکھنے میں دشواری کا باعث بنتا ہے۔ وہ وہاں "مس فٹ" محسوس کرتا ہے خود کو اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنی شناخت نہیں بنا پاتا۔

ابتداء میں انسان نے غاروں میں پناہ لی اور پھر وقت کے ساتھ وہاں سے مختلف جگہوں کی طرف نقل مکانی کی جس سے مختلف معاشرے وجود میں آئے پھر ان معاشروں میں مختلف فرقے بنے جنہوں نے معاشرے کو اپنے رنگ ڈھنگ کے مطابق ڈالا۔

ہر قوم نے اپنی بقاء کی جنگیں لڑی ہیں۔ اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے دوسروں کی شناختوں کو مسخ کیا خود کو مضبوط بنایا۔ شناخت کا مسئلہ موجودہ عہد کا ہی المیہ نہیں ہے بلکہ انسان نے تخلیق کے ساتھ شناخت کی کھوج لگائی اور مختلف طبقات میں تقسیم کے ساتھ ہی شناختی بحران نے جنم لیا۔ اپنی شناخت کا تحفظ کرنا اسے برقرار رکھنا ہر فرد کا پیدائشی حق ہے کسی قوم کو یہ حق نہیں کہ دوسروں کو عدم تحفظ کا شکار کرے۔

کسی خطے میں شناختی بحران تب جنم لیتا ہے جب کسی خطے میں موجود مذاہب، عقائد، رسم ورواج، اقدار، رنگ ونسل، زبان، تہذیب وثقافت سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے غیر مساوی سلوک اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن صرف چند نمایاں مخصوص قوموں سے تعلق رکھنے والوں کے عقائد، مذاہب وغیرہ کو اہمیت دی جائے ان کو مکمل آزادی کے ساتھ تمام حقوق حاصل ہوں لیکن اس خطے میں موجود دوسری کمزور شناختیں یا تارکین وطن کے مذاہب عقائد، تہذیب ان کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے انہیں حقوق نہ ملیں انہیں آزادی حاصل نہ ہو ان کے ساتھ ناانصافی ہو تو وہ شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اس معاشرے میں اپنا وجود تسلیم نہیں کرواپاتے انہیں سمجھ نہیں آتی ہے اب انہیں کیا کرنا چاہیے ان کی زندگی کے مقاصد کیا ہیں اپنے وجود کو تسلیم کروانے میں جو اسے مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کا سامنا کیسے کرے۔ شناختی بحران کا بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تارکین مایوسی و ناامیدی کا دامن تھامے دوہری (دوغلی) شناخت اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں جس سے ذاتی و اجتماعی تصادم جنم لیتا ہے اور خود غرضی اور مفاد پرستی عام ہو جاتی ہے۔ بقول اسلم اعوان:

> شناخت زندگی نہیں نقش زندگی ہے، شناخت کی نمو ایک قسم کا حسی ونفسیاتی عمل ہے۔ [۲۴]

شناخت کے مسائل تارکین وطن کے لیے:

ایک تارکین کا وہ طبقہ ہوتا ہے جو دوسرے معاشرے میں جا کر وہاں کی تہذیب وثقافت، ان کے رہن سہن ان کی زبان، ان کی زندگی گزارنے کے طریقے کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی ان کی روایات واقدار کی پاسداری کر سکتا ہے۔ اسے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہاں اس کے لئے رہنا مشکل ہوتا ہے وہ وہاں دیگر مسائل کا سامنا کرتا ہے نئی جگہ، نئے لوگ، نیا ماحول، وہ اس سب میں خود کو مس فٹ محسوس کرتا ہے۔ وہ وہاں اپنی جگہ نہیں بنا پاتا اور شناختی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔

تارکین وطن میں دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے خطے کو چھوڑ کر دوسرے خطے میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو اپنے وطن سے اپنے ساتھ اپنی روایات، اقدار اپنے رسم ورواج، تہذیب وثقافت وغیرہ لاتے ہیں۔ یہاں

بہتر سہولیات زندگی کے مواقع اور ترقی حاصل کرنے کے لیے مقامی لوگوں جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں ان جیسا لباس پہنتے ہیں ان کی طرح زندگی گزارنے کا طریقہ کار اپناتے ہیں۔ اپنی اصل شناخت کو چھپاتے ہیں لیکن اس عمل سے وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتے وہ نہ مکمل طور پر اس طرز زندگی کو اپنا سکتے ہیں اور نہ چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کی کچھ چیزوں کو اپناتے ہیں اور کچھ کو رد کر دیتے ہیں۔ بعض چیزوں میں اختلاف اور بعض قدروں میں مشترک طور پر متفق ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دوہری شناخت (دوغلی) کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے کہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو مقامی باشندوں کا لباس زیب تن کرتے ہیں تاکہ ہمیں غیر نہ سمجھا جائے۔ ان کی زبان بولتے ہیں اپنی زبان بولتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں۔ لیکن گھر کے اندر اپنا لباس پہنتے ہیں جو ان کی تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے۔ اور اپنی قومی یا علاقائی زبان بولتے ہیں۔ مغربی (امریکی) لوگوں سے میل جول رکھتے ہیں لیکن رشتے داریاں صرف اپنی ذات اپنے لوگوں میں کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے تارکین وطن دوہری زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ساتھ دو خطوں کی تہذیب اور زندگی کو گزارتے ہیں۔ وہ امریکہ و یورپ کے ساتھ ہم آہنگی چاہتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے نظریات و عقائد کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے کی سعی انہیں عدم تحفظ کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

وہ تارکین وطن جو مکمل طور پر دوسری کمیونٹی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں ان کے کلچر کو اپناتے ہیں ان کی طرح کی زندگی گزارتے ہیں ان کی طرح آزادانہ نظریات کا پرچار کرتے ہیں خود کو آزاد خیال کہلاتے ہیں۔ اپنے مذہب سے بھی خاص لگاؤ نہیں رکھتے۔ مغربی کلچر کو پسند کرتے ہیں ان کی طرح پارٹیاں کرنا آزادانہ جنسی تعلق قائم کرنا ان کے لباس ان کی زبان کو اپنا مکمل طور پر ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ اپنے ماضی، تاریخ مذہبی و اخلاقی قدروں کو فراموش کر دیتے ہیں مغرب کی چکا چوند دنیا میں ان کی آنکھیں اندھی تقلید کرتی ہیں۔ اپنی روایات و اقدار کو فرسودہ اور دقیانوسی خیال کرتے ہوئے نئی شناخت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی اپنی شناخت مخدوش ہو جاتی ہے اپنے وطن سے تعلق ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اپنے سے جوڑنے والے تمام محرکات تو وہ خود فراموش کر دیتا ہے۔

ترک وطنی کی مختلف نوعیتیں:

ترک وطنی کی مختلف نوعیتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے درج ذیل یہ ہیں:

۱۔ فکرِ معاش اور بہتر سہولیات زندگی کا حصول

۲۔ جلاوطنی

۳۔ ناساز گار ملکی حالات وواقعات

۴۔ سیاسی وجوہات

تارکین وطن اور شناخت کا بحران:

تارکین وطن سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنا وطن چھوڑ کر کسی دوسرے وطن میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔ تارک وطن کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سے درج ذیل بنیادی وجوہات یہ ہیں۔

روز گار:

بہتر سہولیات زندگی یا فکر معاش میں اکثر لوگ وطن ترک کر کے ایسے ملک میں پناہ لے لیتے ہیں جہاں انہیں بہتر روز گار میسر ہو سکے اور زندگی گزارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولیات ہوں۔ جب بھی کوئی ملک معاشی بحران کا شکار ہوتا ہے تو ملک میں روز گار کے مواقع کم ہو جاتے ہیں تو مجبوراً لوگوں کو اپنا ملک ترک کر کے دوسرے ملک میں رہنا پڑتا ہے جہاں وہ معاشی بحران سے بچ سکیں۔

حصول تعلیم:

تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک ہی علاقے سے دوسرے شہر میں بھی اپنا علاقہ ترک کیا جاتا ہے تاکہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں۔

دہشت گردی:

جب ملک میں ہر طرف خوف وہراس پھیلا ہو، قتل وغارت کا بازار گرم ہو، ملک میں آئے روز بم دھماکے ہوں تو لوگ اس دہشت گردی کی وجہ سے اپنا ملک ترک کر کے دوسرے ملک میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔ اپنی جان کا تحفظ اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک ہجرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مذہبی انتہا پسندی:

جب ملک میں مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو اور فرقہ واریت کا راج ہو وہاں مختلف نقطۂ نظر اور مکتبِ فکر کے حامل لوگوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ان دشواریوں سے بچنے اور اپنی جان کے تحفظ کے لیے دوسروں کے شر سے بچنے اور اپنی مذہبی آزادی کے لیے کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں۔

سیاسی وسماجی مسائل:

ملک میں بڑھتے ہوئے سیاسی انتشار اور سماجی مسائل کسی بھی فرد کو اپنا وطن ترک کرنے اور کسی دوسرے

ملک میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم کے بعد خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں بہت بڑے پیمانے پر لوگوں نے اپنا وطن ترک کر کے نقل مکانی کی تھی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی وہ کسی بھی وجہ سے ہو اسے ترک وطن کہتے ہیں۔ یہ نقل مکانی چاہے بہتر روزگار کے مواقع حاصل کرنے تعلیم حاصل کرنے، سیاسی و سماجی مسائل، جلاوطنی وغیرہ کی صورت میں کی جائے، نقل مکانی کی تاریخ بہت پرانی ہے اور دور جدید کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی ہے جو کسی انسان کو اپنا وطن ترک کرنا پڑ جاتا ہے۔ اپنا وطن ترک کرنے والوں کو جہاں بہت سارے دیگر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں انہیں شناختی بحران کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ نیا خطہ نیا ماحول اپنانے میں اسے دقت ہوتی ہے اسی طرح کیا وہ ملک بھی اسے فراخ دلی سے اپناتا ہے؟ اس کو بنیادی حقوق میسر ہوتے ہیں وہاں کی مقامی عوام اور اس کے حقوق میں تضاد تو نہیں؟ انہیں آزادی سے اپنے نظریات اپنے عقائد کی پیروی کی اجازت ہے؟

اگر ان سوالات کے جوابات نفی میں ملتے ہیں تو وہاں کے تارکین وطن شناخت کے مسئلے کا شکار ہوتے ہیں۔ بظاہر ایک ملک ترک کر کے دوسرے میں منتقل ہونا ایک دلچسپ عمل نظر آتا ہے انسان کو نئے مواقع ملتے ہیں نئے لوگ، نیا ماحول نئی چیزیں سب کچھ نیا اور مختلف ہوتا ہے بہت سے تارکین وطن دوسرے ملک میں مل جل کر رہنے اور ان کی طرح بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کو اپناتے ہیں اور اسی تہذیب و ثقافت میں رنگ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے جب وہ اپنے کسی منفی عمل کے باعث گرفتار ہوتے ہیں تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے متنازعہ اقدار اور منفی کردار ان کے لیے عدم شناخت کا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔

> اکثر ایسا بھی ہوتا ہے جب تارکین کسی دوسرے معاشرے میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ اپنی بنیادی شناخت اپنی روایات و اقدار سے آشنائی کے بعد وہاں اس معاشرے کی اقدار کو اپناتے ہوئے تنازعات کا شکار ہوتے ہیں جس کے باعث مایوسی اور انتشار کے بوجھ تلے ان کی شناخت دب جاتی ہے۔ فرانز فینن کے مطابق استعمار کاروں کے ہاتھوں متعارف ہونے والے کلامیے دیسی باشندوں کی سماجی دنیا کو اس طرح اتھل پتھل کرتے ہیں کہ ہر باشندہ ایک نوع کے وجودی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔۔ نسلی امتیاز مقامی باشندوں کو مسلسل ایک احساسِ کمتری میں مبتلا رکھتی ہے۔ ایسے میں اپنی ذات کی از سر نو دریافت کے لیے باشندے اپنے چہرے پر ایک سفید مکھوٹا چڑھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔[۲۵]

تارکین وطن اپنی شناخت کے حصول کے لیے جو رویہ اپناتے ہیں وہ براہ راست ان کو شناختی بحران کی طرف دھکیل دیتا ہے کیونکہ وہ اپنی اصل سے دور ہو جاتے ہیں۔

نائن الیون کی دہشت گردی:

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء امریکہ کی سر زمین کا سب سے وحشت انگیز دن تھا۔ جس کی مثال اس سے پہلے اس سر زمین پر موجود نہیں تھی اس لیے یہ دن امریکی تاریخ کا نا قابل فراموش دن بن گیا۔ جس میں دنیا کی طاقت ور ترین سپر پاور ملک میں دہشت گردی کا ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا اس دن اور تاریخ کو اصطلاح کے طور پر ۱۱/۹ کا نام دیا گیا۔ دہشت گردی کی ابتداء ۱۱ ستمبر کے حملے سے شروع نہیں ہوئی بلکہ انسانی تاریخ کئی ایسے دہشت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے جس سے انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے لیکن یہاں بات امریکی ملک سپر پاور کی ہے اس لیے دہشت گردی کا وہ شور مچا ہے کہ پوری دنیا کہ اکثر ممالک نے امریکہ کے سامنے ہمدردی کی ہے اور اس واقعے کی بھرپور مذمت کی ہے ۱۱/۹ کے ذہن میں آتے ہی دنیا کے سامنے ورڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا نقشہ ابھرتا ہے۔ ورڈ ٹریڈ سنٹر امریکہ کے شہر نیویارک میں دنیا کی سب سے بلند عمارت ہے۔ اس عمارت کے دونوں ٹاور ۱۳۱۳ فٹ اور ۱۱۰ منزلوں پر مشتمل تھے جس میں تقریبا دنیا کے ہر ملک اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا روز گار وابستہ تھا تقریبا ۵۰ ہزار لوگ اس کے مختلف دفتروں میں کام کرتے تھے۔ ۱۱ ستمبر کی صبح نے نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا اور آنے والے وقت کے حوالے سے خدشات پیدا کیے۔ ۸ بج کر ۴۵ منٹ پر اغواہ شدہ طیاروں کا عمارت سے ٹکرانا اور دنیا کی اس بلند عمارت کا فلک بوس ہونا مختلف سوالات اٹھا رہا تھا۔

اس حملے کے باعث امریکی نہ صرف معاشی بحران کا شکار ہوئے بلکہ ساری قیمتی جانیں اس کی نذر ہو گئیں۔ اس حملے میں تقریبا ۱۰۰۰ مسلمانوں کا خون شامل تھا لیکن پھر بھی سارا الزام مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دے کر تمام مسلمانوں کی شناخت کو مشکوک بنا گیا۔ تمام مسلمان امریکہ کی نظر میں دہشت گرد اور اسلام جنونیت اور شدت پسندی کا مذہب قرار دیا گیا۔

امریکہ پر حملے سے پہلے بھی دہشت گردی کی زد میں مختلف مسلمان ممالک تھے، ہر روز دہشت گردی کا ایک نیا واقعہ جنم لیتا رہا ہے آنکھوں سے آنسو اور زمین میں خون رستا رہا ہے لیکن یہاں کی لاشیں مٹی کا ڈھیر اور انسانوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں دی گئی لیکن امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی کو عالمی دہشت گردی کے تناظر میں مختلف ممالک کو اس کے ساتھ ملاتے ہوئے دہشت گردی کو جنگ کی صورت دی۔

کسی نے امریکہ کے ماتھے پر دہشت گردی کا لیبل نہیں لگایا ہے لیکن امریکی حملے میں فوری طور پر حملے کے کچھ ہی عرصے میں اسامہ بن لادن کو دہشت گردی کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس بات کو بنیاد بنا کر دنیا کے تمام مسلمانوں کو

شک سے دیکھتے ہوئے عالمی و بین الاقوامی سطح پر دہشت گرد کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ نے نسل پرستی، رنگ و قومیت کی تفریق کو فروغ دیا اور دہشت گردی کا سارا ملبہ مسلمانوں کے اوپر گرادیا۔ پھر اپنے ذرائع کو زیر استعمال لاتے ہوئے دنیا کے سامنے مسلمانوں کو وحشی اور جنونی قرار دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اخبار "ٹائمز" میں مساجد کے مینار کو بندوق کی نالی سے تشبیہ دی گئی۔ اور یہ پیغام دیا ہے کہ مساجد کے مینار بھی بندوق کی طرح ہیں جن سے گولیاں نکلتی ہیں یعنی دہشت گرد نکلتے ہیں اور دنیا میں تباہی پھیلاتے ہیں۔ حملے کا تعلق اسامہ سے جوڑتے ہوئے افغانستان پر شدید بمباری کی اور اس مقصد کے لیے پاکستان کو دھمکا کر اس کی سرزمین کو فضائی حملوں کے لیے استعمال کیا اور افغانستان میں لاشوں کے ڈھیر لگادیے گئے۔ بقول جان کولی:

افغانستان کے دیہات، قصبوں اور شہروں پر گولہ بارود کی بارش ہوئی۔[۲۶]

نائن الیون کا حملہ اور ردِ عمل کے طور پر افغانستان کی تباہی یہ صرف دو ممالک کے آپس کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس نے پوری دنیا کو غیر مستحکم اور عدم تحفظ کا شکار کیا ہے۔ امریکہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں بدترین دہشت گردی کر چکا ہے۔ وہ بین الاقوامی قوانین تک کی خلاف ورزی کر لیتا ہے لیکن اس کی طاقت اس پر کوئی حرف نہیں آنے دیتی۔ وہ دوسرے ممالک سے ذخائر اور وسائل تک رسائی کے لیے کوئی بھی بے بنیاد جواز پیدا کر کے حملہ کر دیتا ہے لوٹ کھسوٹ کر اپنے ملک کو فائدہ دیتا ہے۔ ان کی اس خصلت کا اندازہ افریقی باشندوں کے ساتھ کیے گئے حقارت اور پر تشدد آمیز سلوک سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور فلسطینیوں کا بہتا لہو اس کی زندہ مثال ہے۔ جو دہشت امریکہ نے پھیلائی اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے دوسرے ممالک کا استحصال کیا انہیں دبانا کمزور کرنا امریکہ کا شیوہ رہا ہے۔

امریکی اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں تو وہ ان کے حقوق کی تحریک کہلائے گی اور اگر مسلمان یا دوسرے کمزور ممالک کوئی قدم اٹھائیں تو اسے وہ دہشت گردی کہہ دیتے ہیں۔ امریکہ کا یہی دوغلہ معیار دوسرے ممالک میں بسنے والوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بوتا ہے اور جب یہ بیج امریکہ ہی کی ناانصافیوں اور استحصال کے باعث تن آور درخت بن جاتا ہے تب ردعمل سامنے آتا ہے جسے امریکہ بآسانی دہشت گردی کے خلاف جنگ کہہ کر کاٹ دیتا ہے۔

دہشت گردی کے حوالے سے مغرب امریکہ کا دوغلہ رویہ:

امریکہ نائن الیون کے سانحے کے بعد مسلمان اور دہشت گردی کا راگ الاپتا ہے۔ مسلمانوں کو دہشت گرد

جنونی قرار دیتا ہے۔ تاریخ کے اوراق کو پلٹا جائے تو امریکہ کا کردار صاف و شفاف نہیں ملتا ہے۔ اس کے دامن پر لاکھوں بے گناہ معصوموں کے خون کے دھبے ہیں جنہیں وہ چاہے بھی تو مٹا نہیں سکتا۔ امریکہ ہنستے بستے خطے برصغیر پاک وہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے آیا اور اپنی سازشوں سے اس حکومت کو ناکام بنا کر خود قابض ہو گیا۔ یہاں کے وسائل اور معدنیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سب کچھ اپنے ملک پہنچانے لگے۔

افریقہ کی سرزمین کا رخ کیا تو وہاں کے باشندوں کو اپنی دہشت کا نشانہ بناتے ہوئے ان کی مرضی کے بغیر اپنا غلام بنایا ان سے ان کی شناخت چھین لی انہیں اپنی مرضی کے نام دیے اور زبردستی عیسائی بننے پر مجبور کیا۔ رنگ و نسل کے امتیاز کے باعث جو سلوک اہل مغرب نے افریقیوں کے ساتھ کیا تاریخ میں اس ظلم و بربریت کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دہشت گردی اور ظلم و ناانصافی کسی بھی خطے میں کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ ہو یہ غیر اخلاقی ناقابل معافی جرم ہے۔ لیکن اہل مغرب کے نزدیک ان ممالک میں ہونے والا کوئی بھی سانحہ دہشت گردی ہے۔ امریکیوں کا مارے جانا ظلم ہے جبکہ ویسے وہی ظلم و ستم مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے انہیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اسے دہشت گردی کا نام نہیں دیتے۔ ۱۹۴۵ء میں ہیروشیماء اور ناگاساکی بموں کا استعمال اور اتنے بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی امریکیوں نے کی تھی اس میں کسی مسلمان کا نام شامل نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی دہشت گرد صرف مسلمانوں کو ہی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی زندگیوں پر نائن الیون کے اثرات:

نائن الیون کے سانحے کے بعد صورت حال میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں ہیں۔ جن کے سب سے زیادہ منفی اثرات مسلمانوں کی زندگیوں پر پڑے ہیں۔ اور خاص طور پر مسلمان تارکین وطن جو امریکہ میں موجود ہیں ان کی زندگیاں شدید متاثر ہوئیں۔ مغربی طاقتوں نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں پر اپنا تسلط قائم کیا جس کی بدولت انہیں ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، نائن الیون کا سانحہ وقوع پزیر ہوتے ہی مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا اور امریکی دنیا کے لیے مسلمانوں کو خطرہ سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں اور اسلام کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حملے کے بعد عوام اور لیڈروں میں شدید رد عمل سامنے آیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ساتھ دہشت گردی کا لیبل لگا دیا گیا۔ مسلمان تارکین وطن اور ان کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ امریکہ نے مسلمانوں کے بارے میں پوری دنیا میں یہ تاثر پیش کیا کہ مسلمان دہشت گرد، انتہا پسند اور جنونی لوگ ہوتے ہیں۔ نہ خود سکون سے رہتے ہیں نہ باقی دنیا کو رہنے دیتے ہیں اور اسلام ایک شدت پسند مذہب ہے۔ در حقیقت اسلام امن پسند مذہب ہے جو کسی بے

گناہ کے خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ نومبر تک نائن الیون کی با قاعدہ اصطلاح متعارف ہو گئی۔ نائن الیون کے سانحے کے باعث امریکی معاشرے میں تشدد کے رجحان نے جنم لیا، اور غصے اور نفرت کی زد میں افغانستان اور بالخصوص مسلمان تارکین وطن جو امریکہ و یورپ میں قیام پذیر تھے، ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہونے والے کئی ہزار لوگ مختلف مذاہب اور جغرافیہ سے تعلق رکھنے والے تھے جن میں ایک ہزار سے زائد مسلمان بھی شامل تھے۔ مسلمانوں نے اس حملے کو غیر اخلاقی فعل قرار دیتے ہوئے اس واقعے کی بھرپور مزاحمت کی۔ لیکن اس سب کے باوجود ان کے لیے امریکیوں کے دلوں اور ان کی سرزمین میں اپنے لیے جگہ بنانا مشکل ہو گیا۔

بہر حال ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی ایک حقیقت ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ مسلمان امریکیوں کی نظر میں دہشت گرد قرار پائے۔ خاص طور پر افغانستان، پاکستان اور سعودی عرب کو نشانہ بنایا۔ امریکہ میں موجود مسلمان تارکین وطن بھی محفوظ نہیں رہے۔ نائن الیون کے سانحے نے مسلمانوں اور دوسرے تارکین وطن کو تقریباً تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ان کے لیے وہاں رہنا بھی آسان نہیں رہا اور نہ ہی واپس اپنے وطن لوٹ آنا کیونکہ وہ امریکہ کو ہی اپنا ملک سمجھتے اور اسی سے محبت رکھتے ہیں۔ نائن الیون کے سانحے سے تمام امریکی عوام متحد ہو گئی اور اقلیتوں یعنی تارکین وطن کے خلاف عوام اور حکومتی سطح پر مختلف کاروائیاں کیں۔ اور اس کی ذد میں خاص طور پر مسلمان تارکین آئے۔ امریکہ نے قوت کے بل بوتے اور انتقامی آگ میں جلتے ہوئے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جس میں مسلمانوں نے جانی و مالی نقصان برداشت کیا۔ امریکہ میں بے اعتمادی، نفرت، غصہ اور مقامی باشندوں اور تارکین کے درمیان تصادم کو فروغ ملا، غصے کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے امریکہ میں بسنے والے پیدائشی مسلمانوں اور دوسرے ممالک سے آئے مسلمانوں سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ان کی پہچان ان کے نزدیک صرف دہشت گرد قوم اور انتہا پسند غیر مہذب قوم ہے۔

نائن الیون نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ایک مغربی دنیا جو خود کو مہذب اور ترقی یافتہ کہتی ہے دوسرا مشرقی معاشرہ جسے وہ غیر مہذب کہتے ہیں۔ نائن الیون کی دہشت گردی کے بعد یورپ و امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات میں اضافہ ہوا سیاسی و سماجی، معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے برے اثرات مسلمان تارکین کی زندگیوں پر مرتب ہوئے۔ کچھ ہی دنوں میں مسلمانوں کے دینی مراکز کی تباہی، مساجد کا تقدس پامال کرنا، مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا اور ایسے کئی واقعات منظر عام پر آئے لیکن نفرت کی آگ کم نہیں ہوئی۔

پروفیسر خورشید احمد اپنی کتاب مسلم دنیا کی بے اطمینانی میں ان کاروائیوں سے متعلق بیان کیا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں ۳۰۰ انتقامی کاروائیاں درج ہوئیں ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ مسلمانوں کو تعصب کا نشانہ بنایا، عصمت دری کے واقعات سامنے آئے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھوں کو بھی وضع قطع کے باعث انتقامی آگ کا لقمہ بننا پڑا۔

ہندو کہتے ہمیں مسلمانوں کی طرح شلوار قمیض نہیں پہننی چاہیے اور اب ہمیں ماتھے پر بندیا (تلک) لگانا ہوگا تاکہ ہمیں مسلمان نہ سمجھا جائے۔[۲۷]

ہندو عورتوں نے ماتھے پر سندور اور مردوں نے بھی ایسا وضع قطع اپنایا تاکہ انہیں مسلمان سمجھ کر ان پر تشدد نہ کیا جائے۔ مابعد نائن الیون نہ مسلمانوں کی جان محفوظ رہی نہ ہی عزت انہوں نے اپنا مقام کھو دیا۔ محض شک و شبہات کی بنیاد پر مسلمان تارکین کو بے دردی سے قتل کیا۔ داڑھی والوں کو طالبان دہشت گرد ہونے کے شک کی بنا پر بغیر تحقیق کے نشانہ بنایا جاتا۔ تارکین اور خاص طور پر مسلمان اپنے بچوں کے سکول جانے سے خوف زدہ ہو گئے اور عورتیں گھروں سے باہر نکلنے سے خوف زدہ ہو گئیں۔ مسلمانوں کے اسلامی سنٹر تباہ کیے گئے۔ مسلمانوں کے گھروں میں شک کی وجہ سے چھاپے مارے جاتے جس سے تارکین عدم تحفظ کا شکار ہو گئے۔ انہیں لباس، رنگت، زبان و بیان کی وجہ سے بھی مشکوک سمجھا جاتا ملا۔

گیارہ ستمبر کے بعد مغرب میں خاکی رنگت والے افراد کے خلاف نفرت اور شک شبہات کا رجحان غالب ہو گیا۔ گھروں سے باہر بلکہ گھروں کے اندر بھی غیر محفوظ ہو گئے۔ مسلمان کسی بھی گلی، بازار، سکول، دفتر کسی ادارے میں محفوظ نہیں رہے وہ اپنا لباس پہننے سے کترانے لگے ہمیں اس لباس میں دیکھ کر کوئی ہمیں دہشت گرد سمجھ کر نقصان نہ پہنچا دے۔ مغربی باشندے تارکین مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے مسلمانوں کو بعض اوقات جہازوں اور گاڑیوں سے اترنا پڑا۔ کچھ منٹوں یا گھنٹوں تک کے سفر میں بھی امریکی مسلمانوں کو برداشت نہیں کر رہے تھے۔ پاکستانی امریکیوں اور وہاں کے مقامی امریکیوں کے ساتھ تعلقات بھی پہلے جیسے نہیں رہے مسلمانوں کو نفرت اور حقارت آمیز رویوں کا سامنا تھا۔ دفتروں میں بھی مسلمان تارکین کے ساتھ غیر مساوی سلوک روا رکھا جاتا کیونکہ ان کی نظر میں بھی دہشت گردوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے۔ یہ اسی رویے کے مستحق ہیں، محبت اور خلوص کے قابل نہیں ہیں ملازمتوں سے مسلمانوں کو فارغ کیا گیا وہ معاشی بحران کا شکار ہو گئے۔

کسی بھی جگہ پر ملازمت حاصل کرنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ امریکی عورتوں سے شادی کرنے والوں کو اپنے ہی گھروں میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا آپ مجرم لگتا۔ لوگ تنہائی اور ڈپریشن کا شکار ہو گئے۔ راہ

چلتے مسلمانوں کو اکثر یہ جملے سننے کو ملتے کہ تم لوگ اپنے ملک چلے جاؤ تم لوگ دہشت گرد ہو۔ معمولی شک وشبہ کی وجہ سے کسی وجہ سے کسی بھی مسلمان کو پکڑ کر جیل میں قید کر دیا جاتا۔ مسلمان تارکین کو ہراساں کرنے ان کے ساتھ تشدد آمیز کاروائیوں کے کئی چھوٹے بڑے واقعات کی تفصیل منظر عام پر آئی۔ "دہشت کے بعد" کتاب میں" مکالمے اور دہشت کی گونج نائن الیون کے بعد مذہبی خواتین کی صدائیں' میں مصنفہ ڈیانا ایل ایک مسلمانوں کے خلاف امریکیوں کی نفرت اور شدت کی عکاسی کے طور پر واقعہ پیش کرتی ہیں۔

> ایری زونا کے شہر میسا میں ایک سکھ بلبر سنگھ سوڈھی کو محض اس لیے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ اس نے جو پگڑی پہنی تھی وہ اسامہ بن لادن کی پگڑی سے مشابہ تھی۔[۲۸]

نائن الیون کے بعد نسلی تعصب اور مغرب و مشرق والوں کے درمیان امتیاز کے باعث مسلمانوں کی زندگیوں میں مسائل اور تارکین احساس کمتری اور مایوسی و ناامیدی کا شکار ہوئے کیونکہ اس سانحے کے بعد ان کے بنیادی حقوق کا استحصال ہوا ان کی جانیں غیر محفوظ اور معاشی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس حملے سے صرف عمارت ہی فلک بوس نہیں ہوئی بلکہ امریکن اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی، مذہبی، نظریاتی، سیاسی، وسماجی تقسیم ہوئی جس سے دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ پیدا ہو گیا۔

نائن الیون کی دہشت گردی کے افغانستانی مسلمانوں کی زندگیوں پر اثرات:

نائن الیون کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں امریکا نے ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اور نومبر کے آخر تک امریکی فوج نے افغانستان پر بمباری کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی۔ دہشت گردی کا باب نائن الیون کے حملے سے نہیں کھلتا اس سے ماقبل بھی دہشت گردی کا بازار گرم تھا لیکن اس کا شکار اکثر مسلمان ممالک ہوئے اس لیے وہ ولولہ نہیں مچایا گیا جو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی پر مچایا گیا تھا۔ کیونکہ امریکی زمین پر اس طرح اور اتنے شدید حملے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اس لیے امریکہ کے لیے یہ سانحہ برداشت کرنا کافی مشکل ہو رہا تھا۔ تاریخ کے اوراق پلٹیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج امریکہ جس افغانستان طالبان کو دہشت گرد کہہ رہا ہے روس کے خلاف اس نے انہیں اکسایا ان کی مالی امداد کی اسلحہ فراہم کیا اور انہیں طاقت دی، جب روس افواج افغانستانی طالبان کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے تو واپس پلٹ گئے۔ نائن الیون کے حملے سے درحقیقت امریکہ کو موقع مل گیا کہ وہ افغانستان پر قابض ہو اس پر اپنا تسلط جما کر تیل کے ذخائر سے مستفید ہو سکے۔

دہشت گردی کو محض کسی مخصوص ملک سے منسلک نہیں کیا جاسکتا جہاں بھی کسی بھی ملک میں بے گناہوں

کا خون بہایا جائے، ان پر ظلم و ستم ہو، انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا جائے ڈرا دھمکا کر ان سے مفادات حاصل کرنا ۔لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا، خوف میں مبتلا کرنا کسی انتہائی دہشت ناک صورت حال پیدا کر دینا جس سے لوگ ڈر جائیں۔ دوسروں کو ڈرانا دھمکانا چاہے وہ ملکی غیر ملکی یا بین الاقوامی سطح پر ہو یہ دہشت گردی ہے۔ اس صورت میں امریکہ خود دہشت گردی کا مرتکب ہے اس نے کھلے عام اعلان کیا جو افغانستان کے خلاف دہشت گردی کی جنگ میں اس کا ساتھ نہیں دے گا وہ دشمنوں میں شمار ہو گا اور ایسے ہی ڈرا دھمکا کر اور اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے پاکستان کی سر زمین افغانستان کے خلاف جنگ میں استعمال کی۔ نائن الیون کے باعث افغانستان کے مسلمانوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

> افغانستان کی عوام کو کھلی جارحیت کا نشانہ بنایا، محض طاقت کے بل پر اپنی بالادستی قائم رکھنے اور وسط ایشیاء کے وسائل سے مالا مال علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ریاستی دہشت گردی کے بدترین اور ظالمانہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔[۲۹]

امریکہ کو افغانستان پر فوج کشی کا جواز نائن الیون کے حملے نے فراہم کیا امریکہ نے افغانستان پر بمباری بارش کی طرح کی، جس کی وجہ سے افغانستان کے قصبے دیہات، اور شہری آبادی ویرانے کی صورت اختیار کر گئے۔ بموں اور میزائلوں کی گونج تلے، بچے، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کی چیخ و پکار دب گئی۔ ان کے گھر نذر آتش کر دئے گئے۔ ہسپتالوں کو نشانہ بنایا گیا تعلیمی ادارے تباہ کیے گئے۔ افغانستان جو پہلے ہی معاشی بحران ک شکار تھا مذید بھوک و افلاس نے ڈیرے ڈال لیے اور رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ افغانی مسلمان جس جارحیت کا نشانہ بنے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کی جانب سے افغانستان میں سفاکی، ظلم اور جس وحشی پن کا مظاہرہ کیا گیا اس کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے برطانوی ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر "جمی ڈاؤن" نے ایک فلم بنائی جس میں اس تمام صورتحال کی پیشکش دیں۔ قیدیوں کو معافی نہ ملی بلکہ اذیت نات موت دینا، لوگوں کو قتل کرنے کے علاوہ زندہ لوگوں پر تیزاب ڈالنا، لاشوں کی بے حرمتی کی اور ان کی عورتوں کی عصمت دری جیسے غیر انسانی و اخلاقی فعل شامل ہیں۔

مغربی میڈیا کی دہشت گردی نائن الیون کے تناظر میں:

عالمگیریت نے جہاں پوری دنیا کے فاصلے مٹا کر ایک دوسرے کے ساتھ روابط قائم کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں وہاں بہت سارے منفی اثرات بھی دنیا پر مرتب ہوئے ہیں۔ کسی دیہات میں ہونے والا چھوٹا سا سانحہ یا کسی شہر میں ہونے والی دہشت گردی محض اس دیہات یا شہر تک محدود نہیں رہی بلکہ میڈیا کے ذریعے یہ خبر منتوں میں ایک دوسرے ملک بلکہ پوری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ میڈیا کئی حقائق سے چشم پوشی تو کہیں مبالغہ

آرائی سے کام لے کر دنیا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ خبر ایک سے دوسری جگہ تک پہنچتے ہوئے قطرے سے دریا بن جاتی ہے۔ نائن الیون کے تناظر میں جب مغربی میڈیا کے کردار کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے۔ دہشت گردی کے نتیجے کے طور پر مزید ذرائع ابلاغ کی دہشت گردی اور معاشرے میں نفرت اور انتقامی ردعمل کے جذبے کو فروغ دینے میں مغربی میڈیا نے اہم کردار ادا کیا۔

نائن الیون کی دہشت گردی کے ساتھ ہی میڈیا نے اسامہ بن لادن مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا۔ ہر اخبار، نیوز چینل، ریڈیو، انٹرنیٹ سے مسلمانوں کو دہشت گرد ہونے کی کبریں گردش کرتی رہیں۔ ساتھ ہی مغربی میڈیا نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ شروع کی جس کے نتائج نہ صرف مسلمان امریکی تارکین بلکہ دیگر مسلمان ممالک کو بھگتنے پڑے اس سے نہ صرف مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیل رہی ہے بلکہ پوری دنیا میں بدنامی ہوتی ہے۔ امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی ہر بڑے چھوٹے واقعے کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا جاتا ہے ۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جب امریکہ میں دنیا کے مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ کا قتل ہو گیا رپورٹر نے اخبار میں یہ خبر دی کہ وزیر خارجہ کے کمرے سے افریقی سکہ بر آمد ہوا ہے افریقی سکہ یہ ظاہر کرنا چاہا قتل افریقہ کے کسی فرد نے کیا ہے جب تفتیشی افسر کو کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے سکہ ملا جس کی رپورٹر نے پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی۔

مسلمانوں نے نائن الیون کے سانحے کے بعد جو مثبت کردار ادا کیا میڈیا نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ میڈیا مسلمانوں کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے وہ ہے منفی ان کی طرف سے کیا جانے والا تعاون امریکی میڈیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اس پر مغربی میڈیا نے مکمل خاموشی اختیار کی تعصب کی جو آگ مغربی میڈیا نے لگائی اس کی چنگاریاں ابھی تک مسلمانوں کے دامن کو پکڑتی ہیں۔ بھارت کے اخبارات اور تبصرہ نگار بھی زور و شور سے افغانستان، پاکستان اور سعودی کے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے۔ ساتھ ہی ایسی خبریں بھی دی اور ساتھ جعلی تصویریں شائع کیں کہ دوسرے مسلمان ممالک اس حملے کا سنب کر امریکہ کے خلاف جشن منا کر اس خوشی کو منا رہے ہوں المختصر یہ کہ میڈیا نے ہر الزام ہر سانحے کا قصور وار بنا کسی تحقیق اور ٹھوس ثبوت کے مسلمانوں کو دیا۔ دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں اور اسلام کو نشانہ بنایا گیا۔ کیونکہ امریکہ اپنے لیے مسلمانوں کو خطرہ سمجھتا ہے۔ در حقیقت دہشت گردی کی عالمی جنگ کے نام پر امریکہ نے خود بہت دہشت گردی کی ہے۔

نائن الیون کے حملے کا ذمہ دار مسلمان ٹھہرے اور سب سے زیادہ مصائب اور نقصانات کا سامنا مسلمانوں کو

کرنا پڑا ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بھی مسلمانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ مسلمانوں نے اس حملے کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے خون کے عطیات بھی دیے امریکی پاکستانی ڈاکٹروں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن ردِ عمل کی زد میں تمام مسلمان آئے چاہے وہ نام کے ہی مسلمان ہوں بالخصوص امریکہ میں تارکین مسلمان اور افغانستان میں بسنے والے مسلمانوں کی زندگیوں پر نائن الیون کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

امریکہ میں ۹/۱۱ کے بعد عدم شناخت کا مسئلہ:

اکیسویں صدی میں گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا سانحہ امریکی سرزمین کا سب سے اہم سانحہ ہے جسے نائن الیون کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے دیرپا اثرات نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا پر مرتب ہوئے ہیں بالخصوص مسلمان ممالک اور مسلمان تارکین جو یورپ و امریکہ بلکہ پوری دنیا میں قیام پذیر ہیں آج بھی ان کی زندگیاں اس سانحے کے بعد متاثر ہو رہی ہیں۔ سرد جنگ کے بعد دنیا کے مختلف ممالک کے مابین اختلافات سیاسی و نظریاتی سے زیادہ تہذیبی و ثقافتی ہیں۔ مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے یہ سوال ضرور سر اٹھاتا ہے کہ "ہم کون ہیں" ہماری شناخت کیا ہے، دوسروں کے ساتھ ملاپ کہیں ہماری تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار کو متاثر تو نہیں کر رہا۔ اقبل نائن الیون وہ پیدائشی امریکی مسلمان اور دوسرے تارکین امریکہ میں بسنے پر فخر محسوس کرتے اپنے اپ کو امریکی کہلواتے کیونکہ وہ اپنے وطن، رہن سہن، رشتے سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے اور اسی کو اپنا ملک مانتے وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کے ساتھ اس سرزمین پر معمول کے مطابق زندگی گزار رہے تھے کہ نائن الیون کے سانحے نے ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ مسلمانوں کی شناخت نائن الیون کے بعد محض ایک دہشت گرد کے طور پر رہ گئی۔

مختصر طور پر دیکھا جائے تو ترک وطنی محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی بھی ہوتی ہے جو انسان کو ماضی کی یاد اور مستقبل کے خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے ہی ملک میں بھی جلا وطنی اور اجنبیت محسوس کرتے کرتا ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات میں اپنے ہی ملک میں بھی دونوں اقوام اجنبیت کی فضا محسوس کرتی ہیں اور تقسیم کے بعد بھی ان کے لیے اپنے ہی وطن میں اجنبیت اور بیگانگی کا احساس جنم لیتا ہے۔ ان کا اپنا ملک کون سا ہے ایسے بہت سارے سوال ان کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ جوش و جذبے کے ساتھ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ترک وطن کر کے آنے والوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شناخت کا پیدا ہوتا ہے۔ اپنا ملک اپنا سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو اپنایا نہیں جاتا۔ ترک وطنی انھیں ایک بار پھر بے شناخت کر دیتی ہے۔ ایسے ہی تارکین وطن جو پاکستان سے امریکہ اپنا وطن ترک کر کے جاتے ہیں ان کی اولادیں وہی جنم لیتی ہیں اسی فضا میں سانس لیتی اور پرورش پاتی ہیں

گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے بعد وہ اپنے ہی گھروں میں جلاوطنی کے احساس سے دوچار ہوتے ہیں اور شناختی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے حملے کا ذمہ دار اسامہ بن لادن کو قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو دہشت گرد کہا گیا ان کو شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ گیارہ ستمبر کے سانحے کو جواز بناتے ہوئے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

حوالہ جات

۱۔ الحاج مولوی فیروزالدین،فیروز اللغات(لاہور:فیروز سنز لمٹیڈ،۲۰۱۰ء)،ص۱۸۵۔

۲۔ شان الحق حقی،فرہنگ تلفظ (اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۸ء)،ص۱۴۷۔۲۶۷۔

۳۔ https://dictionary.cambridge.org/us/dictionary/english/identity-crisis

۴۔ https://www.merriam-webster.com/dictionary/identity Crisis

۵۔ https://www.merriam-webster.com/dictionary/identity crisis

۶۔ https://www.lexico.com/en/definition/identity_crisis

۷۔ https://www.lexico.com/en/definition/identity_crisis

۸۔ https ://www.oxfordlearnersdictionaries.com

۹۔ https ://www.oxfordlearnersdictionaries.comHYPERLINK

۱۰۔ www.collinsdictonary.com/us/dictionary/english/identity-crisis

۱۱۔ https//dictionary.cambridge.org/us/dictionary/english/dentity-crisis

۱۲۔ https ://www.dictionary.com/browse/identity-crisis

۱۳۔ https//www.collinsdictionary.com/us/dictionary/english/identity-crisis

۱۴۔ https ://www.merriam-webster.com/dictionary/identity crisis

۱۵۔ https ://www.merriam-webster.com/dictionary/identity crisis

۱۶۔ https ://en.wikipedia.org/wiki/Erik_Erikson

۱۷۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام تشکیل نوتہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام تشکیل نو، سہیل انجم ترجمہ۔(آکسفرڈیونیورسٹی پریس،۲۰۰۳ء)، ص۲۸۔

۱۸۔ عامر رانا،تجزیات، شمارہ۸۹جولائی تاستمبر(اسلام آباد:روحانی آرٹ پریس،بلیوایریا،۲۰۱۹ء)،ص۸۔

۱۹۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن،ایضاً،ص۱۹۔

۲۰۔ شفیق منصور،تجزیات: پاکستان میں شناخت کی بحث،شمارہ۸۹جولائی تاستمبر(اسلام آباد: روحانی آرٹ پریس،بلیوایریا،۲۰۱۹ء)،ص۱۴۔۱۵۔

۲۱۔ ایس ایم شاہد،پاکستانی معاشرہ اور ثقافت (لاہور:ایورینوپبلس)،ص۲۶۔

۲۲۔ ڈاکٹر نصیر احمد نصیر،اسلامی ثقافت (لاہور:فیروز سنز لمٹیڈ)،ص۴۱۔

۲۳۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن،ایضاً،ص۱۴۔

۲۴۔ اسلم اعوان،تجزیات، شناخت کا بحران حقیقت یا مغالطہ،ص۸۲۔

۲۵۔ احتشام علی،"فرانز فینن:مابعد نوآبادیاتی فکر کا بنیادگزار"مشمولہ دریافت،۳۱(جولائی تادسمبر۲۰۱۷ء) شعبہ اردو،اورینٹل کالج،پنجاب یونی ورسٹی لاہور،ص۲۰۔

۲۶۔ جان کے کولی،غیر مقدس جنگیں، فرخ سہیل گوئندی(لاہور:جمہوری پبلی کشنز،۲۰۱۰ء) ص۱۵۔

۲۷۔ تالیف،اکبر احمد / برائن فورسٹ، ڈیا نا ایل ایک، دہشت کے بعد،ایم وسیم ترجمہ "مکالے اور دہشت کی گونج:نائن الیون کے بعد مذہبی خواتین کی صدائیں"(لاہور:مشعل بکس،۲۰۰۹ء)،ص۴۶۔

۲۸۔ ایضاً،ص۴۶۔

۲۹۔ پروفیسر خورشید،مسلم دنیا کی بے اطمینانی ۱۱ستمبر سے پہلے اور بعد(اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی،۲۰۰۵ء)،ص۱۷۶۔

باب دوم

منتخب اردو ناولوں میں شناختی بحران بطور موضوع: اجمالی جائزہ

باب دوم:

منتخب اردو ناولوں میں شناختی بحران بطور موضوع: اجمالی جائزہ

ناول حقیقت اور تخیل پر مشتمل وہ قصہ ہے جس میں زندگی کے نشیب و فراز کو مصنف کرداروں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ پلاٹ، کہانی، کردار، مکالمہ، صورت، تاثر، منظر نگاری اور تجسس ناول کے بنیادی عناصر میں شامل ہیں۔ جن سے زندگی کے تجربات اور واقعات کی عکاسی کا بخوبی فریضہ سر انجام دیا جاتا ہے۔ ناول فنی پختگی تہذیب و معاشرت سے آگاہی اور تاریخی حقائق سے آشنائی کا تقاضا کرتا ہے۔ اردو ناول نے ارتقاء سے اب تک مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے نئے نئے موضوعات کو اپنے اندر سمویا اور اندازِ بیان میں نئی تکنیکوں کے استعمال سے جدت پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تاریخ کے آئینے میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ اس دور میں سیاسی و سماجی معاشی سطح پر تبدیلیاں مرتب ہوئیں۔ تقسیم کے پیش نظر نسلی تعصب مذہبی اختلافات اور علاقوں نے سر اُٹھایا۔ دو قومی نظریئے کی بنیاد پر صدیوں سے ایک جغرافیے میں بسنے والے، سکھ، مسلمان سب کی جمی جمائی بساط حیات اُلٹ گئی۔ ایک ساتھ رہنا دشوار ہوا۔ مذہبی اختلافات، سیاسی و سماجی اُلجھن اور انتشار نے شناختی مسائل سے دوچار کیا۔

ہندو، مسلم، سکھ سب عدم تحفظ کا شکار ہو گئے، عبادت گاہ غیر محفوظ ہو گئیں، لاکھوں کروڑوں افراد اپنے گھر بار چھوڑ کر زندگی کی بقا کے لیے محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں نکلے، کچھ راستے میں دشمنوں کے ہاتھوں جان کی بازی ہار گئے۔ اور کچھ اپنوں کی جدائی کا غم سہتے ہوئے منزل تک پہنچ گئے۔ مذہب کے نام پر آزادی حقوق کے حصول اور نسلی تعصب کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کی موت، عصمت دری، بے حرمتی، بچوں کو نذرِ آتش اور لاشوں کا تقدس پامال ہوا۔ برصغیر میں اردو ناول میں ڈاکٹر خالد اشرف اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> سامراجی قوتوں کی سازش کے تحت ایک کروڑ افراد اپنے گھر بار چھوڑ کر اجنبی دیاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس خونچکا دور میں مذہب کے نام پر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار اگیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی معصوم بچے زندہ جلا دیئے گئے۔[1]

ہر شخص ہندو، مسلم، سکھ اکثریت و اقلیتوں کے مابین شناخت کا مسئلہ انفرادی و اجتماعی صورت میں پیدا ہوا۔ شناخت کا تعلق کبھی مذہب تو کبھی جغرافیہ، علاقہ، زمین اور نسل وغیرہ سے ہوتا ہے۔ تقسیم کی ہنگامی صورتِ حال

TH23087

نے صدیوں سے بسنے والوں کو پریشان کیا۔ وہ عدم شناخت کا شکار ہو گئے وہ جس خطے میں پیدا ہوئے وقت گزارا وہ ان کا ملک ہے یا جس میں ہجرت کر کے جا رہے ہیں وہ ان کا ملک ہو گا؟۔ ان کی شناخت کس سے منسوب ہو گی۔ فسادات کے نتائج میں قتل و غارت کا ایسا طوفان اُٹھا جس کی زد میں ہندو، مسلمان، سکھ برصغیر میں بسنے والے ہر مذہب کے لوگ آئے۔ تعصب و نفرت کی انتقامی کاروائیوں میں کوئی انسان محفوظ نہیں رہا۔ لوگ اپنے وجود کے تشخص کے لیے وطن ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ برصغیر کی تقسیم نے بھارت اور پاکستان کو وجود بخشا۔

برصغیر کی تقسیم اور ہجرت نے جو چوٹ انسان کی شناخت پر لگائی ہے۔ وہ زخم آج بھی تر و تازہ ہیں۔ ان زخموں سے خون رستا ہے اور بو آتی ہے۔ ہر معاشرے کی اپنی تاریخ، تہذیب، ثقافت، نظریات، اقدار ہوتے ہیں۔ جن کا اظہار وہ اپنے ادب میں کرتا ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے ماحول حالات و واقعات سے کنارہ کشی اختیار کر کے فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے معاشرے کا عکس اُتارتا ہے وہ معاشرے کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جیسا معاشرہ ہے وہ اس کی تشریح کرتا ہے۔ نہ ہی معاشرہ تخلیق کار سے جدا ہو سکتا ہے۔ نہ ہی تخلیق کار معاشرے سے اس کے اثرات سے بچ سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ادب معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے جو بدلتے ہوئے عہد اور صورت حال، تاریخی و سماجی صداقتوں کو دہراتا ہے۔

جب کہیں جنگ و جدل، دہشت گردی، ملکی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو یا مختلف تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ، برصغیر پر انگریزوں کی حکمرانی اور تسلط ہو یا اس سے قبل محمد بن قاسم کی فتح سندھ کی حکومت کا شیرازہ بکھر جانا، ذات پات کا جھگڑا، رنگ و نسل کا غرور، طبقاتی شعور یا کشمکش ہر رنگ ادب میں ہر صنفِ سخن میں جھلکتا ہے۔

ادیب، دانشور، مفکر، شاعر، مصور چاہے کوئی بھی ہو وہ وہی بیان کرتا ہے جو وہ معاشرے میں دیکھتا ہے اسے ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ شناخت کا مسئلہ طاقت ور اقوام کے درمیان پسی ہوئی کمزور اقوام میں جنم لیتا ہے۔ جیسے برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد صرف برصغیر کی تہذیب و ثقافت پر اپنا رنگ اتنا گہرا کر دیا کہ ان کی شناخت کو معدوم کر دیا۔ ہندوستان میں نسلی امتیاز کو ہوا ملی اور تقسیم کی لکیر نے ہندو مسلمان دونوں کے لیے شناختی بحران کو پیدا کیا۔

تارکینِ وطن ہجرت انتشار کے عہد میں نمائندہ اردو ناول پر اثرات:

تقسیم کے بعد خاص طور پر تخلیق کاروں نے ہجرت اور تارکین وطن کے مسائل کو موضوع بناتے ہوئے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ترکِ وطن اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مصائب و مشکلات کے اظہار میں

قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، خدیجہ مستور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' اس میں تقسیم ہند اور طبقاتی کشمکش بڑی طاقتور اقوام کا دوسروں کی شناخت مسخ کرنا حقارت آمیز رویوں کی عکاسی کی ہے۔ بکھرے وجود اور عدم شناخت کے دوراہے پر کھڑے تارکین وطن کا نوحہ بیان کیا ہے جس کی بازگشت اردو ادب کی دنیا میں آج تک سنائی دیتی ہے۔ ایسے ہی انتظار حسین کا ناول 'بستی' اور آگے سمندر ہے' میں اپنی جائے پیدائش سے بچھڑنے کا غم اور نئے ماحول سے جڑنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اپنی شناخت کا حوالہ ڈھونڈتے ہیں۔ ترک وطنی داخلی وباطنی طور پر بکھراؤ اور تہذیبوں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت حال جنم لیتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس کرب کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریروں بالخصوص 'دیس ہوئے پردیس' 'اے غزال شب' 'راکھ' خس وخاشاک کے زمانے 'وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو تارکین وطن کی بے سروسامانی اور وطن کی مٹی کی حقیقت کو عیاں کرتے ہیں۔ خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن' برصغیر کی تقسیم کی دین ہے۔ سیاسی وسماجی بدلتے رجحان اور دو مختلف نقطہ ء نظر کے حامل لوگوں کے درمیان تصادم کی جھلک عیاں ہوتی ہے۔ آنگن سے متعلق روبینہ الماس اقمطراز ہیں۔

> آنگن اس سارے انتشار اور بحرانی کیفیت کو پیش کرتا ہے جو تقسیم سے قبل ہندوستان وپاکستان کے عوام کو سہنا پڑا ہے۔ اور معاشرے میں فرد اور حالات کے درمیاں عدم مطابقت کا باعث بنا۔[۲]

قراۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہندوستان کی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات ماقبل اور مابعد تقسیم تارکین وطن، اجنبیت، بیگانگی اور جلاوطنی کے باعث مسخ شدہ شناخت کی تلاش میں بھٹکتے کرداروں کی کہانی ہے۔ اسی طرح قراۃ العین حیدر بھی اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں شناخت کے حوالے بیان کرتی ہیں۔

> "تم کون ہو بھائی" نیچے سے کسی نے پوچھا
> 'میں ہوں' گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا
> 'تمہارا نام کیا ہے' میں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔[۳]

مصنفہ نے ہندو مسلم کے درمیان نظریاتی ٹکراؤ، تہذیبی وثقافتی تصادم، عدم شناخت اور حالات و واقعات کی تغیر پذیری کو جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

گردش رنگ چمن میں شناختی بحران:

گردش رنگ چمن قراۃ العین حیدر کا مشہور ناول ہے۔ جس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۸۶ء تک کی بے بس نسلوں

کی کہانی کو بیان کیا ہے معاشرے میں اقدار کے زوال پزیر ہونے اور کرداروں کے حالات وواقعات کو تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ کردار ماضی کی پرچھائیوں اور بدلتے حالات کے پیش نظر شناختی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔۱۸۵۷ء کے سیاسی انتشار کے باعث اور گردش حالات کے ہاتھوں مجبور طوائف خانے کی زینت بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی کردار نواب فاطمہ ہے اس کا تعلق ایک اچھے خاندان سے تھا یہ وابستگی ماضی کی یاد بن کر رہ جاتا ہے شناخت چھین گئی اور دربدری اس کا مقدر ٹھہری۔ یہ ناول کا مرکزی کردار ہے جو گردش زمانے کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی شناخت گنوا کر طوائفوں کے کوٹھے پر جا پہنچی ہے۔ نواب فاطمہ جو کہ بیگم بن چکی اس کی زندگی میں آنے والا رینال انگریزوں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ان دنوں کی بیٹی عندلیب اور اس کی بیٹی عنبرین ایسے کردار ہیں جو تاحیات شناختی بحران کا شکار رہتے ہیں۔

عنبرین کی ماں عندلیب بانو بیگم اپنی ماں کا نام گلرخ بانو بیگم بتاتی ہے۔ [۴]

عندلیب اپنی ماں فاطمہ کو گلرخ بانو بیگم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہاں ہر کردار وسروں کے سامنے اپنی شناخت چھپاتا ہے جس کے لیے وہ اپنا نام بدل کر خاندانی پس منظر کو چھپاتے ہوئے اپنا تعلق کسی نہ کسی نواب سے جوڑتے ہیں۔ تارکین جب اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں پناہ لیتے ہیں وہاں انھیں شناختی بحران کا سامنا ہوتا ہے۔ ان کی شناخت اپنے جغرافیے سے ہے جہاں وہ جنم لیتے ہیں کسی دوسرے ملک میں قیام انھیں دوسروں جیسا بننے پر مجبور کرتا ہے جس کے باعث وہ دوہری شناخت اپناتے ہیں۔ جیسے ناول میں مصنفہ ایسے کردار پیش کرتی ہیں جیسے کہ فاطمہ، عندلیب وغیرہ ان سے جائے پیدائش چھین جاتی ہے تو وہ ساری زندگی دربدر پھرتے شناخت کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ جیسے عنبرین کلکتہ میں رہتے ہوئے اپنا نام اور لکھتی ہیں اور انڈیا میں جاکر نام بدل لیتی ہیں در حقیقت یہ کردار خود کو اس ماحول میں مس فٹ محسوس کرتے ہیں۔

کلکتہ کے سکول اور کالج میں اس کا نام عنبرین بیگم لکھا گیا تھا۔ یہاں انڈیا میں مس بیگم چل رہا تھا مگر ڈنبر میڈیکل کالج والے بیگم بابا کا نام سمجھتے لہذا بیگ کرنا پڑا۔ [۵]

گردشِ رنگ چمن کے زیادہ تر کردار ماضی کے حوالوں سے خود کو نئے ماحول میں مس فٹ محسوس کرتے ہیں۔ شاندار ماضی کو یاد کرتے ہوئے ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نواب بیگم، عندلیب، عنبرین بیگ، دل نواز، مہرو، ڈاکٹر منصور، نگار خانم ناول کے اہم کردار ہیں۔۱۸۵۷ء کے بعد جہاں معاشرے میں تغیرات نے جنم لیا۔ طوائفوں نے مضبوط ادارے کے طور پر اپنے قدم جما لیے۔ لیکن بعد میں ایسی کایاپلٹی کہ سب کردار خزاں رسیدہ پتوں کی طرح

بکھر جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں بے سکونی، بے اطمینانی عہدِ حاضر کے سماجی اقدار میں مس فٹ نہ ہونے کے باعث ہوتی ہے۔ جیسے نواب فاطمہ اور رینال کی بیٹی عندلیب عمر بھر تشخص کی جنگ لڑتی ہے اور پھر اس کی بیٹی عنبرین شناخت کی تلاش میں سرگرداں سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ عندلیب کا باپ عیسائی اور ماں مسلمان ہے اس لیے بیٹی مذہبی جغرافیائی بنیادوں پر بھی شناختی الجھن کا شکار ہے۔ بلآخر ماں کے پیشے کو ناچاہتے ہوئے بھی اپنالیتی ہے عندلیب کی بیٹی عنبرین ماں سے مختلف خیالات و نظریات کی حامل ہے لیکن ماں کی طرح عدم شناخت کی سولی پر لٹکی نظر آتی ہے ۔ عنبرین تعلیم یافتہ ڈاکٹر ہے لیکن اس کے باوجود احساس کمتری میں مبتلا اور ڈپریشن کا شکار رہتی ہے۔ عنبرین کے ذہنی انتشار کے حوالے سے ڈاکٹر نائید قمر لکھتی ہیں:

عنبرین کا ذہنی خلفشار دراصل تشخص کا بحران ہے۔[۶]

گردش رنگ چمن زمانے کی گردش میں پسی ہوئی نسلوں کی داستان ہے جہاں وہ نسلیں جغرافیائی، مذہبی، تہذیبی، لسانی حوالوں سے شناختی بحران میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ ناول کے کردار بعض جگہوں پر ذاتی شناخت، خارجی شناخت اور سماجی شناخت کے دائرے میں تیرتے نظر آتے ہیں۔ بعض کردار دوہری شناخت اپنائے وقت اور علاقے کی مناسبت سے نام بدلتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

نواب فاطمہ جو شرافت والی زندگی کے احصار سے نمل کر عصمت فروشی کر ادارے کا حصہ بنی اور پھر ان کی لڑکی عندلیب بیگم اسی مرحلے سے گزری اور پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کی تعلیم یافتہ لڑکی جو تشخص کے بحران (identity crisis) سے گزر رہی ہے۔[۷]

ناول تین نسلوں پر مشتمل قصہ ہے۔

عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں شناختی بحران:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اہمیت برصغیر کی تاریخ میں خاص ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی غذر، بعد کے حالات و اقعات، سیاسی و سماجی صورت حال، معاشی واخلاقی قدروں میں بھی انتشار برپاہوا جس نے ادب کو متاثر کیا۔ اردو ادب کے بہت سے نامور مصنفین نے اپنے فن پاروں میں یہ موضوع نقش کیا ہے اسی طرح عبداللہ حسین نے اپنے ناول اداس نسلیں کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس کا دورانیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے برصغیر کی تقسیم اور پاکستان بننے اور بعد تک کے حالات وواقعات پر گہری نگاہ رکھی ہے۔

اس عہد کے معاشی بحران، سیاسی انتشار اور برصغیر کی تقسیم، تہذیبی اتار چڑھاؤ مسلمان اور ہندوستان کے

درمیان نظریات کے اختلافات کے باعث جنم لیتے ہوئے تصادم اور شناختی بحران کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔'اداس نسلیں' کے بارے میں محترمہ نائید قمر ان الفاظ میں اپنی رائے دیتی ہیں۔

> یہ انتشار سے انتشار تک کا سفر ہے جس کی زد میں آنے والی نسلیں اداسی اور قنوطیت کے سائے میں پلتی ہیں۔[۸]

اداس نسلیں در حقیقت شناختی بحران میں مبتلا اداس نسلوں کی کہانی ہے۔ جس میں داخل اور خارج دونوں سطحوں کے مسائل شامل ہیں۔ مصنف نے بالخصوص اس عہد کی تاریخی و نیم تاریخی جھلکیاں، مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان کشیدگی، برصغیر کی تقسیم، نسلی تعصبات دونوں تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ، معاشرت واقدار اور دونوں کی کھوکھلی ہوتی جڑوں سے چمٹی اداس نسلوں کے تہذیبی و شناختی مسائل کو بیان کیا ہے۔ اداس نسلیں گزرے عہد یعنی جنگ آزادی سے قیام پاکستان تک دونوں قوموں کی بکھرتی تہذیبوں کے بحران سے گزرتی اداس نسلوں کے المیے پر مشتمل کہانی ہے۔ جس میں طبقاتی، معاشی، تہذیبی انسانی شناخت کی گم شدگی اور تقسیم کے ساتھ ہی ہندوستان کی مٹی ہوئی تہذیب اور شناخت کا مسئلہ شروع ہوا جو نئے دور میں بھی ایسے ہی رہا اس اعتبار سے اس عہد کی نسل دو رنگوں کی فضا میں آنکھ کھولتی ہے۔ اور اپنے وجود کے تشخص کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں اہل یورپ کے عمل دخل سے ہندوستان کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں وہ اپنی صدیوں پر مشتمل تہذیب کو فرسودہ جاننے لگتے ہیں۔

ہندوستان میں پہلے مسلمان اور غیر مسلم سب مل جل کر رہتے تھے لیکن تقسیم کی لکیر نے دونوں قوموں کے درمیان تعصب، نفرت، نظریاتی اختلافات اور مختلف انواع کے مسائل کو فروغ دیا۔ دونوں اقوام میں الگ لگ قومیت کے نظریے کے ساتھ شناخت کے مسائل پیدا ہوئے۔ ایک نسل کا تعلق ۱۹۴۷ء سے جبکہ دوسری نسل ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں پیدا ہوئی جس کا شاندار ماضی چھین گیا۔ اس کی جغرافیائی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی اور ان کی شناخت ان کی جڑیں اسی خطے سے وابستہ ہیں جسے وہ خیر آباد کہہ چکے ہیں۔ ان اداس نسلوں کا مستقبل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا یہ اداس نسلیں تہذیبی، جعرافیائی، لسانی، مذہبی مسائل کے ساتھ عدم شناخت کے مسئلے سے دوچار ہوئیں۔ پروفیسر ڈاکٹر مزمل اس ناول سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

> اداس نسلیں معنی خیز ہے۔ ایک تو وہ نسل ہے جو ۱۹۴۷ء کے وقت برصغیر میں زندہ تھی، اس کے سامنے ماضی اپنے تمام حوالوں کے ساتھ موجود تھا۔۔۔ اور دوسری طرف آنے والا کل ایک بڑے شناختی بحران کا پتا دے رہا تھا۔ دوسری نسل یا آنے والی نسلیں وہ تھیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد بطور خاص

پاکستان میں پیدا ہوئیں، ان سے ان کا ماضی اور ماضی سے جڑی ساری تاریخ اور ریت روایت۔۔ چھین
کی گئیں۔۔ تہذیبی شناخت کے ساتھ شناختی بحران بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ [9]

اداس نسلوں کی وہ شناخت جو ان کے لیے باعث فخر تھی ان کی شان تھی وہ محض داستانوں کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ دراصل اداس نسلیں میں مصنف اس نظریے کی عکاسی کرتے ہیں کہ جب لوگوں سے ان کی سرزمین ان کی تہذیب و ثقافت ان کا شاندار چھین لیا ان کا مستقبل مشکوک ہو گیا اداس نسلیں بے شناختی کی دھند میں لپٹے کرداروں کی کہانی ہے جو اپنے مسخ شدہ چہروں کو دیکھ کر خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنی شناخت کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔ جنگ آزادی کی کشمکش، ناکامی اور تقسیم کے بعد شناختی بحران لے مسائل تاحال موجود ہیں۔

مصنف نے اداس نسلیں میں برطانوی حکومت سے لے کر تقسیم کے فوری بعد تک کے دور کا احاطہ کیا ہے۔ ہجرت کے باعث لوگوں کی زندگیوں میں آنے والی تغیانی، دربدری، قتل و غارت عورتوں کی آبروریزی، عدم شناخت کا مسئلہ کرداروں کے زریعے عیاں ہوتا ہے۔ فسادات کے باعث لاکھوں لوگوں سے ان کا وطن چھوٹ گیا جس کی وجہ سے ان کی شناخت متاثر ہوئی اور زندگی کی جمی جمائی بساط خزاں رسیدہ پتوں کی مانند بکھرنے لگی۔ اپنے خطے کو ترک کرنے کی اذیت، نئے خطے میں قیام پذیری کے مسائل سے دوچار ہونا، ہجرت کا دردناک المیہ، بکھری لاشیں جابجا دکھائی پڑتی ہیں۔ مصنف نے ان تلخ حقائق سے چشم پوشی اختیار نہیں کی بلکہ ان دکھوں کو اپنے دامن میں سمو کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ تقسیم کے بعد کے حالات واقعات کی منظر کشی مصنف نے کچھ یوں کی ہے:

کوئی درخت کے ساتھ کھڑا مر گیا تھا۔۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے
تھے۔۔ میاں بیوی، بہن بھائی اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہوا تھا جو دنیا
کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ [10]

عبداللہ حسین نے اس ناول میں برصغیر میں بسنے والوں کی غلامانہ طرز پر زندگی گزارنے، فسادات اور اس کے نتیجے میں ہجرت اور اس کے ساتھ جنم لینے والے شناخت کے مسائل، ترکین وطن کی کشمکش، جائے پیدائش یا نئے معاشرے کس کو اپنا مانیں، ہجرت کے المیے کو سنجیدگی سے بیان کیا ہے۔ فسادات کی وجہ سے برصغیر میں بے چینی، سیاسی انتشار، معاشی و سماجی مسائل زور پکڑنے لگے۔ مصنف نے اداس نسلوں کی مایوسی اور محرومیوں اور اندرونی توڑ پھوڑ کا جائزہ لیا ہے اور جس طرح انگریزوں نے برصغیر پر قابض ہو کر یہاں کے لوگوں کی حیثیت اور تاریخی حوالوں کو کمزور کر کے انھیں غیر مذہب، غیر تہذیب یافتہ وحشی انسان کہہ کر ان کی شناخت کو مشکوک بنا دیا۔ وہ لوگ احساس محرومی میں مبتلا ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے برصغیر میں بسنے والی اقوام کو شدید دھچکا لگایا جس سے وہ جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی محکومی کا شکار ہو گئے۔ جغرافیائی تسلط کے بعد مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشی تہذیبی ساخت متاثر ہوئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کرتے گئے تفرقوں اور انتقامی آگ میں جلتے ایک دوسرے کی جان مال، عزت غیر محفوظ ہو گئی۔ ہندوستان میں دو الگ قومیں، دو الگ تہذیبیں، دو الگ شناختیں، جغرافیائی تقسیم چاہتی تھیں۔ دونوں قوموں کے رہن سہن رسم و رواج اور مزاجوں میں فرق عقائد اور نظریات کا اختلاف، تہذیبی و ثقافتی تصادم کے باعث شناخت کا مسئلہ پیدا ہوتا۔

دو الگ قومیں اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں اور اپنی علیحدہ شناخت کی بقاء چاہتی ہیں ان تمام محرکات کے پیش نظر مصنف تقسیم سے قبل اور دوران تقسیم کے فسادات میں پیش آنے والی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ شناختی بحران اچانک سے جنم نہیں لیتا ہے لیکن برصغیر کی تقسیم اور ہجرت کے ساتھ ہی شناختی بحران میں اضافہ ہوا ہے۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کر کے آنے والوں کے خواب پاکستان پہنچتے ہی چکنا چور ہو گئے۔ یہاں انھیں تہذیبی و ثقافتی اور شناختی مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہ جس ملک کو اپنا سمجھ کر آئے تھے اس نے انھیں کھلے دل سے قبول نہیں کیا تب ہجرت زدہ کردار بے سمتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں یہ کردار پناہ لیتے ہیں وہ سرزمین ان کی جائے پیدائش نہیں نہ ہی تاریخ و جغرافیہ سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں پیوست ہیں جہاں ان کا جنم ہوا۔ اس ناول کے کردار ماضی کی یاد سینے میں بسائے آزادی، تقسیم، شناخت اور ہجرت کے قصوں کو سوچتے ہیں۔

ان کی آگلی نسلیں بھی اسی شناختی بحران میں مبتلا رہتی ہیں۔ وہ ماجر ہیں یا اس ملک کے باشندے ان کی ذہنوں میں ایسے ہی سوال جنم لیتے ہیں جیسے ناول کے مرکزی کردار نعیم کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہجرت سے بڑھ کر بھی ان کے لیے المیہ یہ ہے کی کہ اپنا سب کچھ کرنے کے باوجود نئے ملک میں وہ شناخت حاصل نہیں میں ناکام ہوتے ہیں۔ خوابوں کی تکمیل کا شرمندہ تعبیر نہ ہونا انھیں دوہری اذیت ملتی ہے۔

اداس نسلیں کا پہلا حصہ روشن محل کی زندگی، دوسرا حصہ، روشن پور، تیسرے حصے میں جنگ آزادی کے حالات وواقعات اور اس کے اثرات، اور چوتھے میں تقسیم کے فسادات سے پاکستان بننے تک کے حالات وواقعات کو قلمبند کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشر لکھتے ہیں:

> اداس نسلیں میں عبد اللہ حسین نے برصغیر کے ان پسماندہ انسانوں کی بے بسی اور لاچاری کو پیش کیا ہے جن کو برطانوی غلامی اور افلاس نے مضحل، شکستہ اعصاب زدہ اور ستم دیدہ کر دیا تھا۔ [۱۱]

اداس نسلیں میں مصنف نے اداس نسلوں کی بے شناختی کو خوبصورت پیرائے بیان میں رقم کیا ہے۔

بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ میں شناختی بحران:

بانو قدسیہ کا ناول حاصل گھاٹ دو تہذیبوں کے تصادم اور اس صورت میں جنم لینے والے شناختی بحران کا نوحہ ہجرت کرنے والوں کے نام کرتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے ناول میں مشرق و مغرب دونوں تہذیبوں میں سے کسی کی حمایت کرنے کے بجائے معروضی نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے۔ انسان ہمیشہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا ہے اور بعض اوقات وہ اسی تلاش میں اپنے اصل اپنی سرزمین سے دور ہو جاتا ہے۔ مصنفہ براہ راست تارکین وطن کے مسائل اور بے شناختی پر اظہار خیال نہیں کرتی ہیں بلکہ کرداروں کے ذریعہ سے ہلکی ہلکی ضرب لگاتی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ہمایوں فرید مشرق کی اس زبوں حالی پر اداس ہوتا ہے کہ اہل مشرق والے مغرب کی چوکھٹ پر ماتھا کیوں رگڑتے ہیں۔ اپنی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت، روایات و اقدار کو فراموش کر کے غیروں کے طرز عمل کو اپناتے ہوئے دوہرا معیار زندگی گزارتے ہوئے اپنی شناخت تک گنوا بیٹھتے ہیں۔

> امریکن یونیورسٹیوں، دفتروں اور بازاروں میں تارکین وطن کا ایک ریلہ بہہ رہا ہے ان میں چینی، ہندوستانی، عربی اور پاکستانی سب شامل ہیں اور امریکیوں کے نقال بننے پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔ [۱۲]

ہماہوں فرید کا خاندان تقسیم ہند کے بعد بہت سے خواب سجائے پاکستان میں اپنے خوابوں کی ان کہی تعبیروں کی کھوج میں آن پہنچے لیکن یہاں آکر ان کے خواب انکی خواہشات کو وہ تعبیر و تکمیل نہیں مل سکی جس کی انھیں چاہت تھی۔

> ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف ناک چیتے لے کر آئے تھے ان دیکھے کا خوف۔۔ ان جانے کا خوف۔۔ ان چھکے کا خوف۔۔ ان چاہے کا خوف۔ [۱۳]

تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آنے والوں کے خواب ادھورے رہ گئے وہ جسم تو ساتھ سمیٹ لاتے ہیں لیکن روح اسی سرزمین پر بے شناخت پھرتی ہے۔ ناول میں فکری و تہذیبی جہت تارکین کی دوہری شخصیت میں کھو دینے والی شناخت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک پہلو سے جائزہ لیں تو پاکستان اور امریکہ کی زندگیوں اور دونوں معاشروں کا تقابل کرتی ہیں۔ مستقبل سے متعلق خدشے، تارکین کا المیہ، غیر سرزمین پر اپنی جڑیں پیوست کرنے کی کوشش، رنگ و نسل کے امتیازات، ترقی پزیر ممالک سے ہجرت کرنے والوں کی شناخت کو لاحاصل بنا دیتی ہے۔ حاصل گھاٹ جنت سے آدم کی ہجرت سے آج کی ہجرت تک کی داستان ہے۔

ناول میں تارکین وطن کے حوالے تین طرح سے ملتے ہیں :

اوّل: وہ تارکین وطن جو بہتر سے بہترین کی تلاش میں اپنا وطن ترک کر کے غیر سرزمین میں اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش میں اپنی اصل شناخت گھو دیتے ہیں جیسے کہ ارجمند اور بلال ایسے ہی کردار ہیں۔

دوسری طرح کے تارکین وہ ہیں جنھیں فکر معاش اپنی سرزمین چھوڑنے پہ مجبور نہیں کرتی بلکہ دوسوں کو دیکھتے ہوئے محض دکھاوے کے لیے اپنا ملک ترک کر کے غیر سرزمین میں اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں جیسے کہ ناول کے دو کردار جہانگیر اور شاہدہ ہیں۔

تیسری طرح کے وہ تارکین وطن ہوتے ہیں جو باعث مجبوری اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں قیام پزیر ہوتے ہیں جیسے کہ ہمایوں فرید کا کردار ہے۔ وہ اپنے ملک میں بھی تنہا اور امریکہ بیٹی کے پاس جا کر بھی اپنے آپ کو تنہائی ہی محسوس کرتا ہے۔

تارکین امریکہ میں بسنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور ان جیسا بننے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب، رہن سہن، طرزِ حیات کو فراموش کر دیتے ہیں اور مغربی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ مصنفہ نظامِ مغرب کی مادی ترقی اور اس کی جہد وجد اور مشرق والوں کا مادی ترقی کے مواقعوں کی تلاش میں روحانی ترقی کو پس پشت ڈالنے کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ تارکین روحانیت سے دور ہو کر مادیت پرستی کے خول میں بند ہو اپنے آپ کو بند کر لیتے ہیں۔ دونوں تہذیبوں کے تصادم، ہجرت زدہ لوگوں کی شناخت کو غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔ وہ خود کو محفوظ کرنے کے لیے اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں لیکن یہ رنگ عارضی ہیں وہ مکمل طور پر اقلیت کو نئی شناخت عطا نہیں کرتے۔ یہ رنگ وقت کے ساتھ پھیکے پڑ جاتے ہیں اور اصل رنگ کھو دیتے ہیں۔ حاصل گھاٹ میں عمر رسیدہ ہمایوں فرید کے المیے کو مصنفہ اس کی زبانی قاری کے سامنے یوں پیش کرتی ہیں۔

> میرے گھر والے مور کا پنکھ لگا ہنس کی چال چلنے میں برتری محسوس کر رہے تھے۔ اور گویا پتسمہ لے کر نو امریکن ہو گئے تھے۔۔ بیٹی کے گھر اس لیے اجنبی سا لگا پھرتا تھا کہ یہاں پاکستانی ہونا ہی سب سے بڑا قصور ہے۔ [۴۱]

ناول کا راوی ہمایوں فرید محبت میں گندھا ہوا شخص ہے۔ جو امریکہ کی سرزمین میں ماضی کی یادوں کے سہارے جیتا ہے وہ اپنے ملک سے محبت کرنے والا اپنی تہذیب، روایات و اقدار پر فخر محسوس کرتا اپنے خطے سے شناخت وابستہ کرتا ہے۔ وہ اپنی شناخت اپنے ملک کی زرخیز مٹی سے جوڑتا ہے اس مٹی کی خوشبو میں گزرا عہد یاد کرتا ہے۔ ناسٹیلجیائی کیفیت کا شکار مشرق و مغرب میں پائے جانے والا فرق ابتداء سے تھا اور رہے گا۔ یہ فرق دو تہذیبوں کا ہے جس میں الگ الگ اپنی شناختیں ہیں جو اپنے وجود کا بقاء چاہتی ہیں۔ مغربی تہذیب اتنی باصلاحیت تہذیب ہے کہ

وہ اپنی شناخت کا لوہانہ صرف اپنے ملک کی اقلیتوں بلکہ دنیا کی دوسری تہذیبوں سے بھی منواتی ہیں۔ناول کے اعتبار سے ہر اقلیت اکثریت سے خوف محسوس کرتی ہے۔وہ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے اکثریت کی تقلید کرتی ہے لیکن نہ مکمل پیروی ممکن ہو پاتی ہے نہ ہی اکثریت سے کنارہ کشی اختیار کرنا ممکن ہے۔کئی اکثریت کی تقلید کرتے ہیں۔کئی اپنا راستہ اختیار کرتے ہیں۔آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کی صورت میں وہ نہ اپنی شناخت برقرار رکھ سکتے ہیں نہ ہی دوسری شناخت کو وہ اپناتے ہیں۔ان کی شناخت مشکوک ہو جاتی ہے۔

> ہر اقلیت خوفزدہ رہتی ہے۔وہ مکمل طور پر اپنی شناخت بھی گنوانا نہیں چاہتی۔۔۔یہی دوہری خواہش اس کے خوف کو گھمبیر بنادیتی ہے۔[۱۵]

ہندو مسلم دو الگ قومیں ایک ساتھ رہتی تھیں۔دونوں تہذیبیں ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکیں۔اپنی اپنی شناخت کے لیے جنگ لڑی۔برصغیر کے فسادات کے بعد علیحدگی کی تقسیم کی لکیر کھینچی گئی۔جس سے دو مذاہب دو تہذیبیں اپنی اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے دو خطوں میں بٹ گئیں۔لیکن دونوں تہذیبوں پر مغرب کے اثرات ہیں۔حاکم کی تہذیب،رسم و رواج ان کے زندگی گزارنے کے طور طریقے ان کا لباس ہر عمل کو اپناتے ہیں جس سے ان کی اپنی تہذیب،رسم و رواج میں ملاوٹ آتی جارہی ہے۔جس سے ان کی شناخت متاثر ہو رہی ہے۔شناخت کا مسئلہ ابتداء سے تاحال موجود ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ مزید مسائل زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔

> امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں کھڑے ہو کر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے۔اور اس کی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔اقلیت۔۔اکثریت کے بہاؤ میں ایسے بہنے لگی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل۔[۱۶]

تارکین ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر زندگی میں کہیں کسی غلطی سے مسئلے میں پھنس جائیں تو پھر بچنا مشکل ہے۔صرف شک کی بنیاد پر بھی مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہوئے قید کیا جا سکتا ہے۔مرد حضرات داڑھی رکھتے ہیں تو اس بات کا ضوف ہوتا ہے کہ داڑھی کی وجہ سے دہشت گرد جنونی مسلمان نہ سمجھ لیا جائے۔ان کے لیے اپنی شناخت قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔وہ اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے روبینہ اور اس کا شوہر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انہیں امریکہ میں رہنا چاہیے یا اپنے وطن واپس لوٹ جانا چاہیے۔وہ دنیا کی ترقی کی فکر کریں یا آخرت کی فلاح کا خیال کرنا چاہیے۔خوف کی بے نیام تلوار ہمیشہ ان کے سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔وہ اس معاشرے میں آسانی سے گزارا کرنے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔کہ اس معاشرے کی اقدار کو اپنایا جائے اور اسی تگ و دو میں اپنی شناخت پر سوالیہ نشان پاتے ہیں۔

سارا بکھیڑا اقلیت ہونے کا ہے۔ انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی۔۔۔ اگر یہاں رہنا ہے تو لبرل ہونا پڑے گا۔ داڑھی والے آدمی سے لوگ ایسے ہی بدک جاتے ہیں۔[۷۱]

تارکین وطن جب کسی دوسرے ملک میں قیام کرتے ہیں۔ اگر وہ زیادہ سوالات کریں تو انہیں لاعلم جان کر کمتر جانتے ہیں۔ ناول میں دونوں تہذیبوں کا تقابل ہمایوں فرید قدم بقدم کرتے ہیں۔ دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے زندگی سے متعلق غور و فکر کرتے ہیں۔ مشرقی نظام میں زندگی خاندان کے ساتھ ہے۔ انسان کی پہچان اس کے اپنے خاندان سے وابستہ ہے۔ خاندان کی عزت فرد کی عزت، خاندان کی ذلت فرد کی ذلت لیکن مغربی نظام اس کے برعکس ہے۔ وہاں ہر فرد خاندانی نظام سے آزاد اپنی شناخت رکھتا ہے۔ رسم و رواج کی زنجیریں کسی کے پاؤں کی بیڑیاں نہیں بنتی ہیں۔ وہاں ہر فرد آزاد انفرادی شناخت رکھتا ہے۔

شخصی آزادی ہر فرد کو حاصل ہے لیکن اس سے امریکی معاشرہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ روحانیت سے دور بے سکونی کا شکار ہو رہے ہیں۔ تنہائی، بے اطمینانی، بے سکونی اور دوہری شخصیت کے لبادے میں بے شناخت ہو رہے ہیں۔ مغربی معاشرے میں آزادی کی دوڑ میں دوڑتے لوگ رشتوں کی پہچان سے بیگانے ہو چکے۔ شاہدہ اور ارجمند دونوں مادی ترقی کے حصول کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر امریکہ میں آ بسنے اور بعد میں اپنی روایات، اقدار غرض جو چھوڑ آئے اسے فراموش کر چکے اور جو حاصل ہے اس سے بھی مطمئن نہیں۔ فکر معاش اور آزاد ماحول کے لیے اپنا وطن ترک کرنے والے مشینی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں کہ اپنی شناخت تک گنوا دیتے ہیں۔

تارکین وطن اور عدم شناخت:

تارکین وطن اکثریت کی تقلید میں اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔ مقامی باشندوں جیسے بننے کے لیے ان کی تہذیب، رہن سہن کو اپناتے ہیں اپنی تہذیب، رہن سہن اور درج ذیل عناصر کو فراموش کر کے اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔

زبان، لباس، رسم و رواج، (تہذیب) مذہب سے دوری

تارکین دوسرے ملک جاتے ہی سب سے پہلے اپنا لباس چھوڑ کر وہاں کا لباس پہنتے ہیں۔ لباس ان کے ملک کی پہچان کرواتا ہے۔ لیکن تارکین اپنی وہ شناخت سب پر عیاں کرنا چاہیے۔ جیسے ارجمند پاکستان میں شلوار قمیض زیب تن کرتی تھی۔ جیسے کہ شلوار قمیض قومی لباس ہے پاکستان کا لیکن امریکہ جاتے ہی جینز وغیرہ پہنتی ہے۔ نہ صرف اپنا قومی لباس اپنی شناخت فراموش کرتے ہیں بلکہ اس لباس میں سو خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ انہیں اس کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تارکین کے لیے مجبوری بن جاتی ہے۔ کیوں کہ مقامی باشندے ان سے اس لباس، اس شناخت کے باعث کمتر اور حقیر جانتے ہیں۔ پھر تارکین دوہری شناخت اپناتے ہیں۔ گھر میں اپنا لباس اور باہر وہاں کا لباس زیب تن کرتے ہیں جیسے کہ ارجمند اور دوسرے تارکین گھر میں اپنا لباس پہن لیتے ہیں لیکن باہر اور دفتروں میں جانے کے لیے مغربی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمایوں فرید اور ارجمند کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اس صورتحال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

> تم نے شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟ شلوار قمیض میں بہت odd محسوس کرتی ہوں۔۔ main Stream سے کٹ جاتا ہے آدمی۔ لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے۔ لیکن اگر لوگ اپنی شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔۔۔ابو شلوار قمیض گھر کا لباس ہے۔[۱۸]

تارکین لباس کے بعد جو دوسری چیز اپناتے ہیں وہ مقامی زبان ہے وہ اپنی زبان کی نسبت وہاں کی زبان کو فوقیت دیتے ہیں۔ یوں وہ لباس اور زبان تبدیلی کے ساتھ کو اہنس کی چال کے قابل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لباس کی طرح زبان بھی کسی انسان کی پہچان ہوتی ہے لیکن تارکین اپنی شناخت کو فراموش کرتے ہوئے غیر کا چوغا پہنتے ہیں تاکہ ان کے برابر درجہ حاصل کر سکیں لیکن کبھی بھی کوئی ملک تارکین کو وہ حیثیت نہیں دیتا جو اس کے مقامی باشندوں کی ہوتی ہے۔ حاصل گھاٹ میں روبینہ اور اس کا شوہر ابتداء میں مغربی ماحول کو اپنا لیتے ہیں لیکن اپنی شناخت چھین جانے کے خوف سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس خوف کے باعث ان کا رجحان مذہب کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی خوف کا ایک پہلو نکل آتا ہے۔ کوئی انہیں جنونی دہشت گرد نہ سمجھ لے وہ خوف میں مبتلا ہیں کہ بچے اس مغربی تہذیب اور اس ماحول اور طرزِ زندگی کو اپنا کر اپنی شناخت سے محروم نہ ہو جائیں اس لیے بچوں سے اُردو بولنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی آبائی زبان سے واقف ہوں۔ بچے اس ماحول اس رہن سہن اور مغربی زبان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں۔ کہ اُردو میں بات سن کر بھی جواب انگریزی میں دیتے ہیں۔ تارکین زبان لباس کے ساتھ ساتھ تہذیب، رسم ورواج کو فراموش کر کے غیروں کی تہذیب وثقافت اور رہن سہن کو اپناتے ہیں۔ اپنے مذہبی اقدار کو پس پشت ڈال کر نئی شناخت اپناتے ہوئے مذہبی وابستگی کا اظہار نہیں کرتے تاکہ انھیں تعصب کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

> تمام رشتے، اقدار، رسم ورواج، تہذیبی فارمولے، مذہبی احکامات منہ اٹھائے انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومنے پھرتے ہیں۔۔اقدار، رسم ورواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔[۱۹]

لباس، زبان، تہذیب، رسم و رواج، مذہبی اقدار کی تبدیلی کے باوجود اپنی رنگت کے باعث احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سانولی رنگت سے نجات اور سفید رنگت پانے کے لیے ہر طرح کی کریموں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ رنگت کے امتیاز سے بچ سکیں۔ اقلیت اکثریت کے ساتھ ضم ہونا بھی چاہتے ہیں لیکن جداگانہ شناخت بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ تارکین کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلیں ان کی شناخت مقامی لوگوں کے مدمقابل نہیں ہو سکتی ان کی حیثیت غیر کی سی ہے۔ تب انھیں اپنی شناخت کی بقاء اپنے مذہب، تہذیب و ثقافت، زبان، رنگ و لباس رسم و رواج میں نظر آتی ہے۔ اکثریت اقلیت کو دہشت گرد قرار دے کر دھتکارتے ہیں تب دوہری شناخت کے حامل یہ لوگ اپنی شناخت کی انفرادیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تہذیبی تضاد روایات و اقدار، طرز معاشرت، جغرافیائی حدود، رنگ و نسل کا فرق، زبانوں کا اختلاف، مذہبی عقائد کا جدا ہونا اور تہذیبی تصادم شناختی بحران کو جنم دیتا ہے۔

ناول میں تارکین وطن میں تین طرح کے مسائل خوف، احساس کمتری، شناختی بحران سے دوچار نظر آتے ہیں۔ راوی پورے ناول میں ماضی سے حال اور حال سے ماضی کے گرد گردش میں رہتا ہے امریکی تہذیب میں تارکین کا رہن سہن دوسروں کی تقلید میں اپنی شناخت گھو دینے کے المیے پر افسردہ ہوتا ہے۔ وہ امریکی معاشرے کی تہذیب و معاشرت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا وہ ہر وقت دونوں معاشروں کا جائزہ لیتا ہے۔ بقول منیر احمد فردوس:

> حاصل گھاٹ اپنے ہر پہلو سے قوس قزح کے رنگ بکھیرتی ہوئی تخلیق ہے۔۔ دلچسپ انداز میں امریکی اور پاکستانی معاشرے کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ [۲۰]

حاصل گھاٹ کا کرداروں کا اہم مسئلہ شناخت کی بقاء ہے وہ انفرادی وجود کی شناخت کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں اور کچھ کردار دلبر داشتہ ہو کر الگ شناخت قائم رکھنے کے لیے مذہب کی جانب راغب ہو جاتے ہیں۔ حاصل گھاٹ کا مختصر جائزہ لیں تو مشرق و مغربی تہذیبوں کا تصادم اور اس تصادم کے باعث ناول کے تارکین کرداروں کے لیے شناختی بحران پیدا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجمہ صدیق:

> حاصل گھاٹ کا موضوع دو تہذیبوں کا تصادم اور اس کی وجہ سے انسانی زندگی میں پیدا ہونے والی کشمکش ہے۔ [۲۱]

مصنفہ نے ناول میں فلش بیک کی تکنیک کو استعمال میں لاتے ہوئے دونوں معاشروں کے روشن اور تاریک پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ میں شناختی بحران:

راکھ مستنصر حسین تارڑ کا ناول ہے۔ جس میں انھوں نے ما قبل تقسیم بر صغیر کی سماجی زندگی اور تقسیم کے فسادات، قتل و غارت، تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں کا ہجرت کرنا، بکھری لاشیں اور بھر پاکستان بننے اور اس کی تقسیم بنگلہ دیش کی علیحدگی کی صورت میں کرداروں کو درپیش شناختی بحران کا نوحہ تقسیم کیا ہے۔ ناول کے اہم کردار مشاہد، برگیتا، مردان، شوبھا، فاطمہ، بابو، زاہد کالیا، مسز حسین نمایاں جاندار کردار ہیں۔ ناول کا آغاز حال سے ماضی کا سفر جس میں مشاہد اہم کردار ہے۔ تقسیم سے قبل ایک ساتھ رہنے والے ہندو مسلم فسادات میں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ تقسیم کے فسادات اور دکھ اور ہجرت کی اذیت اور قتل و غارت اور نے شناختی کو مصنف نے خوبصورتی سے موضوع بنایا۔ بقول ڈاکٹر رانی صابر علی:

> یہاں جو کردار ہیں وہ اپنی جڑوں سے وابستہ ہیں اور کسی بھی طرح سے اپنی جڑوں اور شناخت کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔[۲۲]

مشاہد تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ جاتا ہے وہ جب مغرب کے آزاد خیال معاشرے میں قدم رکھتا ہے ۔تو خود کو اس ماحول میں نہیں ڈھال پاتا۔ یہ کردار اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات سے جڑے لوگوں کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ جب اسے رقص و سرود کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ وہ اسے ناپسند کرتے ہوئے کہتا ہے یہ اس کی تہذیب کا حصہ نہیں ہے اس کردار کی اپنی الگ شناخت بر قرار رکھنے میں مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

> ہم کسان لوگ ہیں۔ اور ہمارے ہاں رقص و سرود کو بے حد معیوب گردانا جانا جاتا ہے۔ اور اسے میراثی پنا سمجھا جاتا ہے۔[۲۳]

مشاہد کی پرورش اس کی تہذیب و ثقافت اور اپنے وطن کی خوشبو اسے کسی دوسرے رنگ میں رنگنے نہیں دیتی۔ مشاہد برطانیہ میں برگیتا نامی ایک سویڈش لڑکی سے شادی کرتا ہے اور اپنے وطن لوٹ آتا ہے۔ یہاں ہر کردار شناخت کے مسئلے سے دوچار نظر آتا ہے۔ برگیتا بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جس کے اندر ایسا غم بسا ہے جو اسے ہمیشہ بے چین رکھتا ہے وہ پادری کی اولاد نہیں بلکہ کا کے ایک غریب کسان کی بیٹی ہے۔ جو پرورش پادری کے ہاں پاتی ہے اور تا عمر اپنی شناخت نہیں پاسکتی وہ خود کو کس کے ساتھ منسلک کرے۔ یہی بے شناختی اسے تا عمر اُلجھن کا شکار رکھتی ہے۔

بابو اور فاطمہ کے کرداروں کے ذریعے پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی نوعیت معاشرتی تہذیبی و نسلی

بنیادوں کو بیان کیا ہے۔ فاطمہ مسلمان لڑکی ہندو لڑکے بابو سے شادی کر کے ہندو مذہب اختیار کر لیتی ہے لیکن شوہر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اسے گھر سے نکال دیتے ہیں کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی۔ فاطمہ ایسا کردار ہے جو مکمل طور پر اپنی شناخت کھو چکا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ناول راکھ میں منطقی انداز میں ماضی سے حال اور حال سے ماضی کے واقعات کو پیش کیا ہے ۔ تقسیم کے فسادات، پاکستان بننے کے دلخراش مناظر اور سقوط ڈھاکہ کے حالات و واقعات کرداروں کو ظاہری و باطنی سطح پر کرب میں مبتلا اور اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں دکھایا ہے۔ اپنا ملک چھوڑ کر ہجرت کرنے والے خواہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہمیشہ مصائب کا شکار، یاس انگیزی، جڑ سے اُکھڑنے کا دکھ، بے شناخت ہونے کے کرب کا شکار رہتے ہیں راکھ جگ بیتی ہے۔ جس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

> برصغیر کی تقسیم، فسادات، انسانی خون کی ارزانی مشرقی پاکستان کی بربادی سے بنگلہ دیش کی تخلیق اپنی جڑوں کی تلاش، فکر انتشار مختلف قسم کے مہلک جنون گم ہوئی ہوئی پہچان، بے سمتی وغیرہ شامل ہے۔[۲۴]

ناول میں تقسیم برصغیر کے علاوہ دوسرے اہم سانحہ سقوط مشرقی پاکستان کو رقم کیا ہے ۔ جس میں تمام لوگوں کے جذبات کو مجروح کیا۔ تمام کردار اذیت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ایک وجود کے دو ٹکڑوں میں قوم بھی جغرافیے کے ساتھ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ یہ ایسا اذیت ناک المیہ تھا جس نے افراد سے ان کی شناخت چھین لی۔ وطن سے بے وطنی ہجرت اور ماضی کی یاد دامن میں بسائے افراد اپنی ذات میں بھی بے وطنی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کہ ناول کے اہم کردار مسز حسین، مردان، شوبھاہیں۔ ادب معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ ایک ہی ملک کے رہنے والے بنگالی، پنجابی، پاکستانی میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

مردان پاکستانی آرمی آفیسر بنگلہ دیش میں سرنڈر کرتا ہے۔ بنگالی عورت مہر النساء سے شادی کی لیکن ملک کی علیحدگی کے ساتھ ہی مردان اسراس کی بنگالی بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ یہ دونوں کردار اپنی شناخت اپنا سب کچھ تقسیم کی لکیر کے ساتھ ہی کھو دیتے ہیں۔ ان کی بیٹی شوبھانئے پاکستان میں رہتے ہوئے اپنی شناخت کے بارے میں کشمکش کا شکار ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتی کہ وہ بنگلہ دیش سے ہے یا کہ خود کو پاکستانی مانے۔ اس کی شناخت کیا ہے۔ شوبھا دو دنیاؤں کے درمیان الجھا ہوا کردار ہے جو اپنی اصل کی تلاش میں ہے۔ تقسیم نے کرداروں کو فرسٹریشن اور احساس محرومی اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ مصنف نے راکھ میں کرداروں کا ایسا زوال اور بے شناختی کو بیان کیا ہے جو

ہر کردار کی نس نس میں سرایت کرتا ہے۔بقول غفور شاہ قاسم

راکھ ملک کی نصف صدی کی تاریخ کو ناول کے روپ دیا گیا۔یوں یہ ہماری اپنی کہانی ہے،ٹوٹے ،بکھرے خوابوں کی کہانی،شکست وریخت سے دوچار اداروں کی کہانی ہے۔[۲۵]

راکھ میں محض پاکستانی سماج کی عکاسی نہیں ملتی بلکہ بہت سارے دوسرے ممالک کی تہذیبوں اور کرداروں کو بیان کیا ہے۔انسان وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔تغیر و تبدل کی زد میں ہر معاشرے کی تہذیب و روایات اور ثقافت آتی ہے۔انسان ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بستی بساتا ہے تو اسے اپنی تہذیب و ثقافت سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے،نئے ملک کی تہذیب و ثقافت،اجنبیت،سرد مہری کرداروں کے عمل سے عیاں ہوتی ہے اور ان کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔بقول مہرونہ لغاری:

ان کے کرداروں میں بے نام سی یاس انگیزی،کرب،بے شناخت ہونے،جڑ سے اُکھڑنے کا دُکھ۔۔۔ اپنے ماحول سے کٹ کر زندگی گزارنے کا کٹھن مرحلہ انھیں درپیش رہتا ہے۔[۲۶]

راکھ محض ڈھیر نہیں راکھ کا اس میں انفرادی و اجتماعی طور پر زندگی کی اُونچ نیچ کو کرداروں کے ذریعے عیاں کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول خس وخاشاک زمانے" میں شناختی بحران:

مصنف کا یہ ناول تاریخ اور عہد نہ عہد کئی زمانوں کا قصہ ہے۔جس میں تارڑ نے مخصوص انداز میں فرد اور افراد کے انفرادی و اجتماعی شناخت کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مصنف نے ۱۹۳۰ء سے گیارہ ستمبر کے سانحے اور ۲۰۰۹ء تک کے حالات و واقعات کی منظر کشی پیش کی ہے جس میں بدلتے وقت و حالات کے ساتھ بالخصوص گیارہ ستمبر کے بعد بدلتے تناظر کو بیان کیا ہے۔جس نے انسان کو شناخت کے مسئلے سے دوچار کیا ہے۔ماضی سے روشناسی اور موجودہ عہد کی ترجمانی،طبقاتی تقسیم کی کشمکش،سیاسی و سماجی مسائل کی پرتیں کھول کر بیان کی ہیں۔ناول کا آغاز گورراج سے ہوتا ہے۔اس عہد کے آقا جو رنگ و نسل کے اعتبار سے غلاموں سے الگ ہیں ان کی شناخت الگ ہے۔رنگ و نسل کا امتیاز غلاموں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ان سے ان کی شناخت چھین لی جاتی ہے۔ان کے حقوق کا استحصال کیا جاتا ہے۔لیکن ان کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔حاکم اور محکوم محض دو طبقے ہی نہیں بلکہ دو الگ شناختیں ہیں۔لیکن محکوم کی شناخت محض غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مصنف نے ناول میں تقسیم ہندوستان،جلیانوالہ باغ کا المناک سانحہ،تقسیم کے فساد اور قیام پاکستان کے بعد

سقوط ڈھاکہ، افغان جنگ اور مشرق دور کی حکومت میں ۹/۱۱ جیسے اہم واقعات اور ان کے اثرات بالخصوص کرداروں کے شناخت کے مسئلے کو بیان کیا ہے۔ تقسیم برصغیر کی صورت میں ہونے والی قتل و غارت، گھر بار، سب لٹ جانا، قربانیوں کے باوجود ہجرت کرنے کے وہ مقام و شناخت حاصل نہیں ہوئی۔ جس کے وہ خواہش رکھتے تھے۔ مصنف نے مشرق و مغرب کا تصادم گیارہ ستمبر کا سانحہ اور اس کے پیچھے افراد کے شناختی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ خس و خاشاک زمانے کے اہم کردار بخت جہاں، سروسانسی، لہنان سنگھ، امیر بخش، سلیمان شاہ، اکبر جہاں، کنیز فاطمی، انعام اللہ، روشن اور شباہت شامل ہیں۔

برصغیر کی تقسیم ہندو مسلمانوں کے درمیان کشمکش شناختی بحران زندگی اور موت کی کشمکش اسلاموفوبیا، مذہبی شدت پسندی، گیارہ ستمبر کی دہشت گردی اسراس کی لپیٹ میں مسلمانوں کی کچلی گئی شناخت ناول کے اہم موضوعات ہیں۔ کرداروں کا سب سے بڑا مسئلہ شناخت ہے۔ جس کی وجہ سے ناول کا ایک کردار اکبر جہاں خودکشی کرتا ہے۔ اور بخت جہاں مویوس ہو کر کینیڈا سے دنیاپور رہائش اختیار کرلیتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کی حقیقی شناختیں چھین کر دہشت گرد کی شناخت دی گئی۔ ناول میں سروساسنی اور بخت جہاں کا کردار ناسٹیلجیا کا شکار ہیں۔ جو ماضی کی یادوں کی چنگاریاں سینے میں سلگائے رکھتے ہیں۔ مصنف نے انسان کی شناخت سے منسلک مذہبی، جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی بیانیوں کو بیان کیا ہے۔ شناخت کا بحران سروساسنی جیسے جاندار کردار میں بھی نظر آتا ہے۔ تقسیم کے بعد شکست سے دوچار نئی شناخت میں پناہ تلاش کرنے میں جو سانسی کا سلیمان شاہ ہونا اسی شناختی تبدیلی کا اظہار اس کردار کے ذریعے ملتا ہے۔ بقول بلال حسن بھٹی:

> خس و خاشاک زمانے بیسویں صدی کا تاریخی اظہار یہ ہے۔ انسان کے شناختی بحران، بدلتی تہذیب و ثقافت اور پرانے دم توڑتے سیاسی و سماجی فکری و معاشی نظریوں کی صدی ہے۔ [۲۷]

لہنان سنگھ ایک جذباتی کردار ہے جو اپنی دھرتی سے محبت کرتا ہے۔ اپنی سرزمین کو شناخت کرتا ہے۔ مصنف نے پنجاب کے ان جاٹوں کے احساس تفاخر کو بیان کیا جو نسلی برتری کی وجہ سے دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کم تر ذاتوں کی شناخت نہیں ہوتی۔ رنگ و نسل اور ذات پات کی برتری اور کم تری فرد کی شناخت کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ ناول ناول میں شناختی بحران میں مبتلا دو کردار سروسانسی اور دوسرا انعام الٰہی فکری مباحث میں اہم ہیں۔ سروسانسی ایسے طبقے سے ہے جن کا کوئی دین نہیں نہ خدا کے ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن جب اپنے فکری و نظریاتی مرکز سے ہٹ کر کسی سماج کو اپنانا چاہتے ہیں تو بری طرح شناختی بحران سے دوچار ہوتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم اور پھر مزید تقسیم کے باعث کرداروں کو شناختی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آر یو عرب نو سر، آئی ایم ناٹ اے موزلم اگرچہ نام کا مسلمان تھا انکار بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے سر ہلایا۔ ایم ایم۔ یو کین گوٹو ہیل ۔۔۔ دھکیل کر باہر نکال دیا۔[۲۸]

گیارہ ستمبر کے بعد مغرب میں مسلمانوں کو کسی اہم سے اہم مقامات میں داخل ہونے سے قبل تفتیش کرتے ہیں۔ انھیں دہشت گرد سمجھتے ہوئے حقارت سے دیکھتے ہیں گیارہ ستمبر کا حادثہ جس کے باعث کردار شناختی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سانحہ مسلمانوں کے کردار کو مشکوک کر دیتا ہے۔ اہل مغرب کی نظر میں دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ مسلمانوں سے نفرت کی جانے لگی۔ مسلمان خوف کے باعث مسجد جانے سے گریز کرتے، اپنا لباس پہنتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "قلعہ جنگی" میں شناختی بحران:

مستنصر حسین تارڑ کا ناول 'قلعہ جنگی' ۲۰۰۲ء میں سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اسے اُن افغان بچوں کے نام کرتے ہیں جو بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر اپاہج ہو گئے اور جو کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہو سکتے صرف گول کیپر ہو سکتے ہیں۔ قلعہ جنگی افغانستان کے مشہور شہر مزار شریف سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ اس قلعے میں ۱۵ نومبر سے یکم دسمبر ۲۰۰۱ء تک اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان سات دنوں میں خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ دونوں طرف کلمہ گو، مرنے والوں کی لاشیں قلعہ جنگی میں بکھری کوئی وجود مکمل اور قابل شناخت نہیں تھا۔ طالبان نے جنرل رشید دوستم کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے قلعہ جنگی میں لایا گیا۔ ان سے تفتیش کی جا رہی تھی، کچھ کے ہاتھ ابھی کھلے ہوئے تھے، انہوں نے خوف کے مارے بغاوت کر دی اپنے پوشیدہ اسلحے سے حملہ کر دیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے رشید دوستم نے امریکہ سے مدد حاصل کی انہوں نے بلندیوں سے ڈیزی کٹر گرائے جس کا اثر دیرپا اور لوگوں کے جسموں کے بکھرے ٹکڑوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس صورت حال کی منظر کشی ناول نگار نے ایسے کی ہے۔

امریکی اوپر ہی اوپر کہیں آسمانوں میں تھے اور اپنے بوجھ گرا کر چلے جاتے تھے۔ یہ باجھ پندرہ ہزار پاؤنڈ وزنی ڈیزی کٹر ہوتے تھے جو عرف عام میں منی ایٹم بم بھی کہلاتے تھے۔[۲۹]

قلعہ جنگی افغانستان پر اتحادی افواج کی یلغار اور اس تناظر میں ہونے والے قتلِ عام کے بعد کا منظر نامہ ہے۔ جو اس صورت حال کو المناک انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہ قاری قلعہ جنگی کے قیدیوں کے ساتھ خود کو بھی اس قید میں محسوس کرتا ہے۔ اپنے جسم سے بہتے خون اور رستی پیپ، ڈیزی کٹر کے ٹکڑوں کو جسم میں پیوست پاتا

ہے۔ قلعہ جنگی استعارہ ہے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک کا جس میں انسانوں سے زیادہ پہلی دنیا یعنی اہل مغرب کے جانوروں کی حیثیت اور اہمیت زیادہ ہے۔ وہ جانوروں سے پیار و محبت کا اظہار کرتے لیکن تیسری دنیا سے وابستہ لوگوں کے مارنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے نہ ہی اس بات پر کوئی پچھتاوا کوئی ندامت نہیں ہوتی کیوں کہ ان کی نگاہ میں غیر تہذیب یافتہ وحشی لوگ ہیں جن کی کوئی شناخت نہیں۔ ان پر قابض ہونا ان کے وسائل سے مستفید ہوئے اور ذخائر کو اپنے ملک منتقل کرتے ہیں۔ خود کو اس سب کا حقدار تصور کرتے ہیں۔

جب طاقت ور اپنی طاقت کے نشے میں چور کمزور کے حقوق کا استحصال کرتا ہے۔ انہیں محرومی کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ تو دو صورتیں سامنے آتی ہیں یا تو وہ احساسِ محرومی کے بوجھ تلے دب کر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں اس غلامی محکومی کو قبول کرتے ہیں یا دوسری صورت میں بغاوت کر دیتے ہیں۔ ان کا خون گندے ندی نالوں کی طرح بہایا جاتا ہے۔ زمینی لڑائی کے ساتھ فضائی حملوں کی تاب نہیں لا سکتے۔ وہ طاقت ور کے سامنے مجبور ہو گئے اور، معمولی کیڑے مکوڑوں کی طرح بے توقیر سمجھ کر روند دیا گیا۔ اور افغانستان کی سر زمین سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوئے۔ قلعہ جنگی کے دردناک سانحے سے چلتے پھرتے زندگی سے بھرپور لوگ چند ہی لمحوں میں لاشوں میں تبدیل ہو گئے۔ ایسی لاشیں جنہیں کفن تک میسر نہیں۔ بہت سارے طالبان قلعہ جنگی میں قیدی بنا کر لائے گئے، کچھ نوجوانوں نے بغاوت کر دی جس میں کچھ امریکی اعلیٰ عہدے کے افسران بھی ہلاک ہوئے اور پھر ایسی قیادت برپا ہوئی کہ قلعہ جنگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ قلعہ جنگی کا صحن لاشوں سے بھر گیا۔ کسی کے بھی جسم کے سب اعضاء سلامت نہ تھے۔ اور جو زندہ بچ گئے اس کرب میں مبتلا تھے کہ موت کو زندگی سے بہتر جانتے ہوئے موت کی آرزو کر رہے تھے۔ انسانی جسم ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ زندہ بچنے والے زخموں سے چور اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ وہ اب کہاں جائیں، کہاں پناہ لیں، ان کی شناخت اب کس طور ہو گی، کیا دہشت گرد قرار دے کر موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ شاید ہم بھی سب کی نظروں میں مر چکے ہوں گے۔

> قلعہ جنگی کے صحن میں بکھری لاشوں کے میلے میں ایک گمشدہ بچے کی مانند پریشان گھومتا تھا کہ اب کدھر جائے۔۔ گھر کا راستہ کہاں ہے۔۔ کیوں آیا تھا۔۔ اور اب اُسے کہاں جانا ہے۔ [۳۰]

قلعہ جنگی میں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم ہو گیا ہر جانب لاشیں ہی نظر آتیں ہیں۔ مصنف مغرب والوں کی ان نفرتوں کو بیان کرتے ہیں جنھوں نے دشمنی کا ایسا بیج بویا جو تناور درخت بنتے ہی طالبان اور افغانستان کے بے گناہ رہائشیوں کو خون آلود کر گیا۔۔ سوائے لاشوں کے بس ایک گھوڑا بھولتا ہو آیا اپنے مالک کی بو سونگھتا ہوا قلعہ جنگی میں آ نکلا اور نہ تو دور دور تک قلعے کی حدود میں کوئی چلتا پھرتا انسان نظر نہیں آتا۔

وسیع کچے میدان میں سوائے سینکڑوں لاشوں کے اور چاندنی کے اور کچھ نہیں۔ [۳۱]

المیہ یہ ہے کہ بغاوت نہ کرنے والوں، پشت پر بندھے ہاتھوں والوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ تقریباً آٹھ ہزار کے قریب ہتھیار ڈال دیئے قیدی بنے لیکن صرف تین ہزار تک افراد زندہ بچ سکے۔ ناول میں کرداروں کے ذریعے اس حقیقت اور دردانگیز المیے کی جانب توجہ دلائی ہے جب ایک کردار دوسرے سے کہتا ہے

میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا ہے۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں نے کھول دیئے۔ [۳۲]

ناول کے مرکزی کردار جو قلعہ جنگی کے قیدی بن کر تہہ خانے میں چھپ گئے۔

۱۔ اللہ بخش ۲۔ ہاشم میر ۳۔ شیر ولی ۴۔ جانی۔ جان واکر
۵۔ عبدالوہاب ۶۔ ابو طالب، چی چی ۷۔ مرتضیٰ

عرب، پاکستانی، افغان چیچن، برطانیہ و امریکہ سے تعلق رکھنے والے باشندے قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں شدید زخمی حالات میں جسموں سے رستے خون بموں کے ٹکڑوں کو جسم کے مختلف حصوں میں سموئے خود کو دشمنوں کی نگاہوں سے محفوظ کرنے کے لیے چھپ گئے۔ کسی کا دھیان قلعہ جنگی کے تہہ خانے کی طرف نہیں گیا۔ آخر بھوک و پیاس کی شدت سے نڈھال خستہ حال جسم کو سمیٹے ہوئے کوئی کب تک تہہ خانے میں زندگی گزار سکتا ہے۔ جب بھوک کی شدت زور پکڑتی ہے تو وہ اوپر قلعہ جنگی سے ایک گھوڑا پکڑ لاتے ہیں تا کہ پیٹ کی دوزخ سے نمٹا جا سکے۔ لیکن گھوڑے کو مارنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ سب ایک دوسرے پر بات ڈالتے ہیں۔ جب جانی کو کہا جاتا ہے۔ تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ ہم جانوروں پر ظلم نہیں کرتے اس کے مطابق مشرق والے جانوروں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور وہ لوگ جانوروں سے محبت کرنے والے ہیں۔ جانی مسلمان لیکن پیدائشی امریکی ہے اس کے خیالات اس ماحول کے اقدار و روایات اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے کہ مغرب والے مشرق والوں کو بے حس و ظالم سمجھتے ہیں انہیں خیالات کا پرچار ناول میں جانی کے کردار سے ہوتا ہے۔

مجھے معلوم ہے تم لوگ گھوڑوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔ ہم لوگ گھوڑوں سے پیار کرتے ہیں، تم لوگ نہیں کرتے" ہم واہ ابھی تک تمہارا نسلی غرور ختم نہیں ہوا۔ امریکی تم ابھی تک ہم اور ہم اب تک تم لوگ ہو۔ رنگ و نسل کے جھگڑے ختم نہیں ہوئے۔ [۳۳]

جانی اور ہاشم میر ان دو کرداروں کے ذریعے امریکہ، مغرب والوں کے تیسری دنیا کے باشندوں کے بارے میں خیالات سامنے آتے ہیں۔ جانی واکر پیدائشی امریکی جو پر سکون زندگی چھوڑ کر جہاد کرنے آتا ہے۔ وہ اپنی بے

چین زندگی میں ٹھہراؤ اور مقصد کی تلاش اسے قلعہ جنگی میں لے آتی ہے۔ یہاں ہر کردار کسی نہ کسی سطح پر شناختی بحران کا شکار ہے۔ اپنی شناخت چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے۔

شناخت کا مسئلہ اپنی ذات سے جنم لیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ شناخت کا مسئلہ داخلی سے خارجی سطح پر پھیلا تا چلا جاتا ہے۔ اُلجھن کا شکار ہو کر فرد بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جانی ایک مجاہد امیر ترین انسان کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے بڑوں کے اعمال کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس بات کا اظہار بھی کرتا ہے کہ یورپ و مغرب کا میڈیا ان کی شہادت کو حوروں اور شراب کا لالچ قرار دیں گے لیکن اسے امریکہ میں ہر سہولت میسر ہوتی ہے۔

وہ اس آرائش بھری زندگی کو ٹھکرا کر جہاد کرنے آتا ہے کیوں کہ وہ خود کو مغرب کے ماحول میں مس فٹ محسوس کرتا ہے اس طرز حیات سے اکتا جاتا ہے کیوں کہ وہ طرز حیات و تہذیبی اقدار اس کے نہیں ہیں نہ ہی وہ اس کی شناخت اور اصل سے جوڑتے ہیں اسی لیے وہ اس زندگی سے خود کو قلعے کے تہہ خانے میں پر سکون محسوس کرتا ہے موت سامنے نظر آتی ہے لیکن وہ خوف زدہ نہیں وہ مغرب کی چکا چوند سے دور اپنی جڑیں تلاش کرتے ہوئے مذہب میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور یہ شناخت اسے ترک وطنی کے باوجود مضبوط کرتی ہے۔ ہاشم میر بھی ایک ایسا کردار ہے جو مسلمان ہے لیکن پیدائش اور زندگی مغرب میں بسر کرتا ہے اس کا باپ یر قانونی طور پر سمگل ہو کر مغرب میں جاتا ہے وہاں خود کو بے روزگار ظاہر کر کے ویل فیر چیک وصول کرتا ہے بیوی کو اپاہج کہہ کر اس کی دیکھ بھال کے لیے معاشرتی فلاح و بہبود کی تنظیموں سے رقم بٹورتا ہے غیر قانونی طور پر چھپ کر آنے والوں کو رہائش فراہم کرتا ہے جنھیں وہ غلاموں کے طور پر رکھتا ہے گوریوں کے ساتھ جسمانی تعلقات کو عیسائیت پر اسلام کی فوقیت گردانتا ہے۔ جہاں ایک طرف مذہب کا لبادہ اوڑھے پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہے چندہ دیتا ہے شراب سے دور رہتا ہے لیکن غیر قانونی کام کرتا ہے یہ دوہرا رویہ اس سے اس کی اصل شناخت چھین لیتا ہے اور بچے بھی بے شناختی میں دھنس جاتے ہیں نہ وہ مکمل طور پر مغربی رویات واقدار، تہذیب و ثقافت کی پاسداری کرتے ہیں نہ ہی مکمل مشرقی تہذیب واقدار کو اپناتے ہیں۔

> مجھے بھی بیئر پینے سے منع کرتا ہے۔۔ شراب کو قطعی طور پر ہاتھ نہیں لگاتا تھا لیکن گوریوں سے ہمبستری اور مسلسل ہمبستری کو وہ عیسائیت پر اسلام کی برتری کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ [۳۴]

دوہری شخصیت جیتے جیتے بچے بھی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ کس طرف جائیں؟ کس کی پیروی کریں؟ اس کی اصل شناخت کیا ہے؟ باپ کا دوغلا پن اور دو تہذیبوں میں بٹے ہونے کے باعث اگلی نسل شناختی بحران میں مبتلا

ہو جاتی ہے۔ قلعہ جنگی کا ایک کردار اللہ بخش انتہائی غریب اور محرومیوں میں زندگی بسر کرتا ہے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تو مدرسے میں داخلہ لیتا ہے جہاں مفت کھانا اور رہائش میسر ہوتی ہے اس لیے وہ باآسانی قلعہ جنگی کی قید میں گھوڑے کے پارچے نگل جاتا ہے اسے ایسا کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی کیوں کہ وہ سب سے زیادہ بھوکا تھا۔

> میں ہمیشہ سے بھوکا ہوں۔۔مجھے آج تک کسی نے نہیں پوچھا اللہ بخش اگر تم ہو تو کیوں ہوں کیوں کے میں کمی کمین ہوں۔[۳۵]

اس کو کوئی پوچھنے والا زندگی میں نہ تھا اس کی شناخت معاشرے میں محض کمی کمین کی تھی وہ بے نام سا کردار اپنی شناخت چاہتا ہے اس لیے اپنا آپ منوانا چاہتا ہے۔ محرومیوں کے بوجھ تلے دب کر بے شناخت احساس کمتری میں زندگی بسر کرتا ہے۔

قلعہ جنگی کا ایک کردار بار بار اپنی زمین کو یاد کرتا ہے مٹی کی محبت، وطنیت سے انسان کی شناخت وابستہ ہے اس لیے وہ وطن سے دور دیار غیر میں اپنے گاؤں میں کو یاد کرتا ہے۔ گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد امریکہ کا رخ افغانستان کی جانب ہوا اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی یہ ایسا تاریخی المیہ جو سیاسی و سماجی زوال کے دھارے پر نئی نسل کو شناختی بحران کی طرف دھکیلتا ہے۔ افغانستان کی تباہی و بربادی کا سیاسی و سماجی نظام کی بدامنی، انتشار، زندگی کے نشیب و فراز کی داستانیں سماجی و معاشی تباہی نے نقشہ بدل دیا۔ ناول نگار نے اللہ بخش کے زریعہ ذات پات اور نسلی تعصب کو پیش کیا ہے کہ کیسے طاقت ور کمزور کو کم حیثیت سمجھتے ہوئے ان کے حقوق کا استحصال کرتا ہے جس سے وہ احساس محرومی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔

موت کی سیاہی ان کے رنگ و نسل کو مٹا کر شناختی بحران سے دوچار کر دیتی ہے۔ قلعہ جنگی میں بکھری لاشیں رنگ و نسل سیاہ و سفید کی تمیز سے ماورا ہو چکی جن کی شناخت مشکل ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے ناول غلام باغ میں شناختی بحران:

غلام باغ مرزا اطہر بیگ کا شاہکار ناول ہے۔ اس کے بیانئے میں ماضی کے حالات، حال کی بے ترتیبی اور مستقبل کے بارے میں کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ اس کشمکش سے پیدا کردہ شعور عصری کیفیت کا شعور ہے۔۔ اس کے حالات و واقعات ناول کا پوسٹ کالونیل دائرہ متعین کرتے ہیں۔ مصنف نے بدلتے رجحانات کے ساتھ نت نئے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔ بالخصوص سیاسی و سماجی مسائل اور ان کے معاشرے پر اثرات، معاشی ناہمواریاں، نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تبدیلیاں، ہجرت، نقل مکانی، تارکین وطن کے مسائل، مزاحمی رجحان اور دیگر

مصنوعات شامل ہیں۔ غلام باغ کے موضوعات میں ،ذات پات کا نظام، سامراجی قوتیں اور مقامی نسلوں کا استحصال ،شناختی مسائل ، تاریخی و تہذیبی پہلو، جنسی ہیجان، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، معاشی بحران، ذہنی کشمکش ، نسلی فسادات وغیرہ کو سلیقے سے بیان کیا ہے۔ ناول ارزلی نسلوں کا تذکرہ ایک مظلوم کمتر نسل کے طور پر ملتا ہے۔ جو ارزاں نسلیں در حقیقت شرقی اور تیسری دنیا کے افراد پر مشتمل وہ قوم ہے جو مغرب والوں کے نزدیک آج بھی غیر مہذب ،غیر تہذیب یافتہ قوم ہے۔ غلام باغ مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی ورثے اور تاریخ کا شاندار حوالہ ہے۔ جس میں ماضی کی بازگشت سنی دیتی ہے۔

ماضی محض ناسف ہے یا پھر کبھی کبھار یہ احساس فخر بھی بن جاتا ہے اور مستقبل بس اک خدشہ۔[۳۶]

اکیسویں صدی کا سب سے بڑا اہم مسئلہ شناخت کا ہے اور بالخصوص تیسری دنیا کے افراد کے لیے شناخت کا مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ 'غلام باغ' لاہور کا بلند و بالا عظیم مسلمانوں کی تہذیبی ورثے کی وہ نشانی ہے جو زمانے کی ستم ظریفیوں کے باعث کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جو مسلمانوں کی عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ مسلمانون کی وہ شناخت جو دھند میں لپٹی نگاہوں سے محو ہو چکی ہے۔ غلام باغ ایک مسلمان کے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے۔ جس کے حصول کے لیے وہ کیس کرتا ہے لیکن بین الاقوامی ادارے حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اسے کسی فرد کی ملکیت میں نہ دیا جائے اور عدالتیں فیصلہ مغربی حکومتوں کی منشا کے مطابق دیتے۔ جس سے مشرقی ممالک کے اندر مغرب کی طاقت اور مداخلت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ غلام باغ میں چلتے پھرتے گورے اکثر اس پر قابض ہونے اور ان اثاثوں کو اپنے زیرِ استعمال رکھنا چاہتے ہیں۔ جو پہلے ہی سامراجی قوتوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔ تاریخ کے اوراق کو پلٹیں تو ہمیشہ سے انگریز اپنی سفید رنگت پر غرور کرتے ہیں اور خود کو اعلیٰ نسل اور مہذب تہذیب یافتہ قوم سمجھتے ہیں ان کے سامنے ہمیشہ ساہ رنگت کے حامل افراد اور براؤن فام لوگ خود ہی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سفید فام لوگ ان کو حقیر جانتے ہوتے تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد نے جہاں مقامی باشندوں کو احساس کمتری میں مبتلا کیا وہیں عدم شناخت کا مسئلہ پنپتا ہے۔ اور انگریزوں کے اقتدار کے بعد یہ مسئلہ زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے اور تاحال یہ مسئلہ موجود ہے۔ نو آبادیاتی عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ آج بھی ان کے اثرات کے زیرِ اثر ادب تخلیق پاتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ غلامی ہاتھوں کی زنجیروں سے نکل کر گلے کا طوق اور ذہنوں میں تہہ در تہہ جم چکی ہیں۔ احساس کمتری کے مارے لوگ اپنی اصل شناخت کو کھو دیتے ہیں وہ خود ہی اپنی اصل سے دور ہو جاتے ہیں۔ رنگوں کا امتیاز انھیں

نفسیاتی طور پر تنہائی کا شکار بناتا ہے۔

> مانے یا نہ مانے لیکن چٹی چمڑی، گورے بدن کا جادو بڑا ظالم ہے، سفید فام بندے کو دیکھ کر دل کے اندر کہیں گھونسا سا پڑتا ہے۔ [۳۷]

غلام باغ مسلمانوں کے شان و شوکت کے زمانے عروج کے عہد کی نشانی ان کی عظمت کی مثال ان کی شناخت کا قصہ ہے۔ جو زمانے کے نشیب و فراز کی بدولت شکست خوردہ ہے لیکن کھنڈرات عمارات کی عظمت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ کھنڈر مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالی اور بے شناختی کا نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی ،ان کی تہذیب و ثقافت، اقدار اور ان کی تاریخ ناقابل فراموش ورثہ جو ان کی شناخت ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی چکا چوند فریب کاریوں کے بوجھ تلے دب کر بے نام و نشاں قبروں میں تبدیل ہو۔ لیکن ذہنوں میں دھندلے نقوش باقی ہیں۔ جو انہیں ماضی کی یاد اور کرب کی کیفیت میں بے سر و سامان اپنی شناخت کو چھپے پردوں میں تلاش کرتے ہیں اور کئی اپنی شناخت سے خود ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت پر مغربی استعمارات نے شدید اثرات چھوڑے ہیں۔ جن سے نجات تاحال ممکن نہ ہو سکی۔ ان کے خزانوں پر مغرب والے قابض ہو کر وسائل سے مستفید ہوئے اور ایک بار پھر غلام باغ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔

مغربی تہذیب کی اندھی تقلید مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے دور شناخت کے بے نام و نشاں عبرت کا نشان بنا دیتی ہے۔ رتبہ و مرتبہ محض دیواروں پر آویزاں اس کیلنڈر کی مانند ہے۔ جس پر وقت کی جمی دھول نے اسے سیاہ کر دیا ہے۔ مرزا اظہر بیگ مختصر مگر جامع انداز میں ان خیالات کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

> دس سال سے پرانا اسلامی کیلنڈر ،دیوار کے ایک کونے میں لٹکے مکڑی کے جالے، جالے میں مکڑی، سٹول، چوکی، پانی کو ٹونٹی، قطرہ قطرہ پانی گرتا ہے۔ [۳۸]

سامراجی قوتوں کے حقارت آمیز رویے اور ذلت تیسری دنیا کے افراد کو اپنی شناخت اپنی ثقافت سے وابستہ اقدار کو اپنانے کی بجائے مغربی اقدار اور ان کی تہذیب و ثقافت کی تقلید کرنے مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ پہلے ہی احساس کمتری اور احساس محرومی کا شکار ان جیسا بننے کی کوشش ذہنی غلامی کی علامت ہے۔ ناول میں ہاف مین کا کردار پہلی دنیا یعنی مغربی تہذیب و ثقافت اور اس معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ غلام باغ پر تحقیق کی غرض سے یونیورسٹی کی جانب سے آیا ہے۔ اس کے ساتھ مقامی افراد کبیر ،ڈاکٹر ناصر، زہرہ تیسری دنیا کے افراد ہیں۔ جو مغربی زبان کو اپناتے ہیں۔ دوسروں پر اپنا اچھا تاثر پیدا کرنے کے لیے اکثر انگریزی بولتے ہیں۔ خود کو نمایاں کرنے کے لیے انگریزی کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنی زبان کی بے توقیری اور بے قدری کرتے ہیں۔

زبان کسی فرد کی شناخت کا ایک نمایاں عنصر ہے اور وہ اسی پر غیر زبان کو فوقیت دیتے ہیں۔ اپنی شناخت کی جڑوں کو خود ہی کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ زہرہ، ڈاکٹر ناصر اور کبیر ہاف مین کے ساتھ اسی کی زبان میں محو گفتگو ہوتے لیکن جب وہ اپنی زبان بولتے ہیں تو ہاف مین سمجھتا ہے مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں۔ یعنی اہلِ مغرب کے نزدیک مشرق والوں کی زبان محض گالیاں دینے کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تہذیبی یا سنجیدہ گفتگو نہیں ہو سکتی۔ کبیر کے ساتھ ہاف مین کی ہانے والی گفتگو مغربی سوچ ان کے نظریات جو وہ مشرق والوں کے بارے میں رکھتے ہیں ان کی عکاسی کی ہے۔

دراصل قصور میرا اپنا ہی ہے مجھے اپنا گورے آدمی کا فاصلہ بر قرار رکھنا چاہیے تھا۔ گھٹیا، غیر مہذب، پسماندہ لوگوں سے میل ملاپ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ [۳۹]

ہاف مین رنگ و نسل کے غرور میں مبتلا محض ایک کردار نہیں بلکہ مغربی پورے عہد کی نمائندگی کرتا ہے جہاں خود کو مہذب اور مشرق والوں کو غیر مہذب پسماندہ قرار دیا جاتا ہے۔ جس سے ان کے ہاں شناخت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اطہر بیگ نے اس ناول میں انگریزوں کے قابض ہونے اور اس کے بعد ان کے معاشرت پر اثرات کو کرداروں کے ذریعہ جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ کرداروں کے درمیان ٹکراؤ در حقیقت تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ ہے جیسے کبیر اور ہاف مین کے درمیان ہونے والی نوک جھوک دو لوگوں کے درمیان کی سوچ یا اختلافات نہیں بلکہ دو معاشروں کے تصادم کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ شک اور خوف میں مبتلا کردار طاقت ور کے ظلم اور اس کے لالچ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں بھوری رنگت کے حامل افراد کو جانور سمجھا جاتا ہے نیلی آنکھوں والے سفید جلد والے لوگ مہذب تہذیب یافتہ انسانوں میں خود کو شمار کرتے ہیں۔

نیلی سفید آنکھوں میں سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھنے والے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اسی لمحے اس بھورے حیوان نما انسان نے ایک بھرپور گونجتا قہقہہ لگایا۔ [۴۰]

ہندوستان اور پاکستان کے ماضی میں یہ المیہ انہیں کرب میں مبتلا کرتا ہے کہ مغرب نے ان کو غلام بنا کر بے شناختی کی طرف دھکیل دیا جہاں وہ کسی درست سمت کا تعین نہیں کر پاتے۔ ان کے سماج، نظامِ تعلیم، جغرافیہ، زبان سب پر اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔ مصنف نے مشرق و مغرب کی ذہنیت کو سائنس اور آرٹس کی تعلیم سے متعلق بیان کیا ہے۔ آرٹس سے بیگانگی اس سے در حقیقت مسلمانوں کی اپنی تاریخ، تہذیب و زبان سے بیگانگی کا بیان ہے۔ یہی بیگانگی اور لاتعلقی نہیں عدم شناخت کے مسئلے سے دوچار کرتی ہے۔ مغرب نے مشرق کے باشندوں کو کمزور کر کے ان کے سیاسی، تعلیمی، معاشی، نفسیاتی نیز ہر معاملے میں مداخلت کو اپنا وطیرہ بنایا۔ برصغیر سے خوب فائدے اُٹھائے۔ ان

کی شناخت کو دبایا جیسے کہ غلام باغ میں برصغیر میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> اشرفیوں سے بھرا ایک صندوقچہ پڑا تھا۔۔ پتا نہیں وہ سب کچھ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ پچاس سال بعد اب بھی حقیقت میں مدد علی اپنی انہی گم شدہ سیڑھیوں اور اشرفیوں کے صندوقچے ڈھونڈنے نکلتا تھا۔ [۴۱]

مدد علی کا کردار اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مسلمان آج بھی اپنے اصل کی تلاش کرتے ہوئے ماضی کی گلیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ شناخت کا مسئلہ داخلی اور خارجی دونوں صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ ناول میں اکبر کی اندرونی کشمکش اپنی ذات کے بارے میں اُلجھن، تذبذب کی کیفیت میں وہ بے سکون رہتا ہے۔ اکبر کی خود کلامی اس کی شناخت سے متعلق کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ وہ اپنے خیالات و افکار، جذبات و احساسات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے سوچوں کی منہ زور لہروں میں جکڑا جاتا ہے۔

> پتہ نہیں میں کیا ہوں کبھی شاید جب کبھی میں نے اپنا کام مکمل کر لیا تو پھر میں بتا سکوں گا میں کیا ہوں۔ [۴۲]

ڈاکٹر ناصر، کبیر، زہرہ کسی کا بھی تعلق اُونچی ذات سے نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات کو چھپاتے ہیں۔ مصنوعی خول میں ہر کردار لپٹا نظر آتا ہے۔ جسے کہ مانگر جاتی وہ ارذل نسل ہے جو دوسری نسلوں کے مقابلے میں کمتر درجے کی نسل ہے۔ جس کی حیثیت معاشرے میں کیڑے مکوڑوں کے مقابلے میں کمتر درجی کی نسل ہے۔ اگر اس نسل سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ طبقے کے مد مقابل آنا چاہتے ہوں تو ان کے ساتھ انتہائی غیر مناسب اور غیر اخلاقی برتاؤ کیا جاتا ہے۔

> کبھی ان مانگر لوگوں میں کوئی۔۔ برابری کرنے کی کوشش کرتا۔۔ اس کا علاج وہی کرتے ہیں جو پاگل کتے کا ہوتا ہے یعنی موت۔ [۴۳]

یہ نسلی تعصب انہیں اپنی شناخت کو دبانے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر کوئی ارزل نسل کا فرد پڑھ لکھ کر سرکاری ملازمت یا کسی عہدے پر فائز ہو جائے تو اپنی بستی چھوڑ کر نئی بستی میں چلے جاتے ہیں اور نئی شناخت قائم کر لیتے ہیں۔ کئی نسلوں کی بے توقیری کے بعد ارذل نسل کے ایک فرد یاور عطائی کا باپ خادم حسین ڈاکیا کی سرکاری ملازمت حاصل کر لیتا ہے اسے ایک کتاب کا مسودہ ملتا ہے جو کہ ''گنجینہ نشاط'' کے نام سے ہے۔ جسے وہ اصل مالک کی وفات کے باعث کسی کو نہیں دے پاتا وہ مسودہ مرتے وقت اپنے بیٹے کو دے دیتا ہے۔ اور مرنے سے پہلے اس کی گفتگو جو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ نسلی تعصب کی عکاسی کرتی ہے۔

ہم پنچ نسل کے لوگ ہیں۔۔ماگر جاتی وہ ارذل نسل جو سو کڑ نہر کنارے پڑیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتی ہیں۔[۴۴]

لسانی، مذہبی، تہذیبی و ثقافتی عوامل و عناصر، روایات اور اختلافات کا تضاد مختلف اقوام کے میں تعلقات کی کشیدگی، تہذیبی کشمکش اور نسلی تصادم، کمزور طبقے کو شناختی بحران میں مبتلا کرتا ہے۔ غلام باغ کا مرکزی نسائی کردار زہرہ ہے۔ زہرہ یاور حسین کی بیٹی ہے جو خود کو عطائی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ زہرہ شناختی مسائل سے دوچار ہے۔ وہ اپنی اصل اور نسل کے بارے میں کشمکش کا شکار ہو جاتی ہے۔ بالاخر ڈاکٹر ناصر کی کیمرہ کی مدد سے اپنی شناخت تک پہنچ جاتی ہے جہاں وہ مایوسی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ارذل نسل سے ہے جس کی حیثیت سماج میں معمولی کیڑوں مکوڑوں سے بھی کمتر ہے۔

انسان نے وقت و حالات کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کیے ہیں اور ان مراحل کو طے کرتے ہوئے بعض اوقات اسے اپنا وطن ترک کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ دوسرے معاشرے اور ملک میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اور جب اسے وہاں کا شہری تسلیم نہ کرتے ہوئے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی مسئلہ کسی معاشرے میں جنم لیتا ہے اس معاشرے کا احساس طبقہ اسے محسوس کرتے ہوئے مختلف اصناف سخن میں موضوع بناتا ہے۔ برصغیر کی تقسیم میں شناختی بحران کا احساس زیادہ نمایاں ہوا ہے تخلیق کاروں نے اردو ادب میں شناخت کے مسئلے کو خاص طور پر قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا، گردش رنگ چمن کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں کرداروں کی مسلسل ترکِ وطنی اور ماضی کی یاد شعور کی رو کی صورت میں عیاں ہوتی ہے نئے حالات نیا ماحول کرداروں میں اجنبیت اور بیگانگی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح انتظار حسین نے اپنے ناول آگے سمندر ہے میں ترک وطنی کے بعد ماضی کی یاد اور بے وطنی کے احساس کو ابھارا ہے۔ عبداللہ حسین نے اداس نسلیں میں تقسیم کے حالات وواقعات، سیاسی و سماجی صورت حال اور شناختی بحران میں مبتلا اداس نسلوں کی کہانی بیان کی ہے۔ اسی طرح بانو قدسیہ نے "حاصل گھاٹ لکھ کر اور خدیجہ مستور نے آنگن، لکھ کر کرداروں پر گزرے حالات وطن کی یاد، بے وطنی کے احساس اور فرد کے شناختی بحران کو بیان کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول 'خس و خاشاک، راکھ، قلعہ جنگی' اور دیگر کئی اہم ناول ہیں۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ بھی اس کڑی کا اہم حصہ ہے۔ اس حوالے سے دیگر کئیں مصنفین نے طبع آزمائی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد اشرف،برصغیر میں اردو ناول (لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء)،ص ۱۴۲۔

۲۔ روبینہ الماس،اردو افسانے میں جلا وطنی(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۲ء)،ص ۲۳۔

۳۔ قرۃالعین حیدر، آگ کا دریا (لاہور:مکتبہ جدید،۱۹۶۸ء)،ص ۳۶۸۔

۴۔ قراۃ العین حیدر،گردشِ رنگ چمن(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۸ء)،ص ۱۸۷۔

۵۔ ایضاً،ص ۳۵۔

۶۔ ناہید قمر،اردو فکشن میں وقت کا تصور(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۸ء)،ص ۱۵۷۔

۷۔ ممتاز احمد خان،اردو ناول کے چند اہم زاویے(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۳ء)، ص ۹۳۔

۸۔ ناہید قمر،ایضاً،ص ۱۱۷۔

۹۔ www.sangatacademy.net/cms

۱۰۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص ۵۹۳۔

۱۱۔ خالد اشرف،برصغیر میں اردو ناول(لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء)،ص ۲۱۲۔

۱۲۔ انور سدید،بانو قدسیہ:شخصیت اور فن(اسلام آباد:اکادمی ادبیات ،۲۰۰۸ء)،ص ۱۲۸۔

۱۳۔ بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،ص ۳۶۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص ۱۸۳۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۱۸۴۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۱۷۹۔

۱۸۔ ایضاً،ص ۳۸۔

۱۹۔ ایضاً،ص ۴۴۔

۲۰۔ منیر احمد فردوس،ماہنامہ ادب لطیف۔اپریل(لاہور:۲۰۰۷ء)،ص۱۲۵۔

۲۱۔ نجمہ صدیق،پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول(لاہور:اظہار سنٹر اردو بازار، ۲۰۰۸ء)،ص۳۱۳۔

۲۲۔ رانی صابر علی، سقوط مشرقی پاکستان اور اردو ناول مشمولہ معیار ۱۳، جنوری تاجون(اسلام آباد: شعبۂ اردو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی،۲۰۱۵ء)،ص۱۳۔

۲۳۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص۲۵۲۔

۲۴۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان،اردو ناول کے چند اہم زاویے (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء)،ص۱۹۹۔

۲۵۔ غفور قاسم شاہ،پاکستانی ادب کی شناخت کی نصف صدی(راولپنڈی: زیر پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص۲۱۵۔

۲۶۔ مہرونہ لغاری، ہجرت، بکھراؤ، انتشار اور اردو کے نمائندہ ناول نگار مشمولہ بازیافت (لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، دسمبر ۲۰۱۶ء)ص۳۴۴۔

۲۷۔ www.mukaalama.com

۲۸۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۴۷۹۔

۲۹۔ مستنصر حسین تارڑ،قلعہ جنگی(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)ص۵۱۔

۳۰۔ ایضاً،ص۸۔

۳۱۔ ایضاً،ص۲۵۔

۳۲۔ ایضاً،ص۴۰۔

۳۳۔ ایضاً،ص۹۴۔

۳۴۔ ایضاً،ص۱۰۰۔

۳۵۔ ایضاً،ص۱۱۶۔

۳۶۔ مرزا اطہر بیگ، غلام باغ(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)ص۱۲۔

۳۷۔ ایضاً،ص۱۷۔

۳۸۔ ایضاً، ۲۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۷۔

باب سوم

طاؤس فقط رنگ میں کرداروں کے زریعے
شناختی بحران: سیاسی وسماجی پس منظر میں

باب سوم:

طاؤس فقط رنگ میں کرداروں کے ذریعے شناختی بحران:

سیاسی وسماجی پس منظر میں

سرد جنگ کے اختتام اور اکیسویں صدی کی ابتداء میں تیز رفتاری کے باعث دنیا میں بہت ساری تبدیلیاں رونماں ہوئیں۔ایک تہذیب کے دوسری تہذیب کے ساتھ تصادم نے افراد کو شناختی بحران کے مسئلے سے دوچار کیا ہے۔وہ اس صورت حال میں اپنے لیے جگہ نہیں بناپاتے ہیں۔شناخت کا مسئلہ ابتداء میں انسان کی ذات سے متعلق پیدا ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی داخلی اور خارجی کیفیات کو متاثر کرتے ہوئے فرسٹریشن اور احساس کمتری کی صورت میں ابھرتا ہے۔شناخت کا مسئلہ محض سماجی و معاشی طور پر فرد کی انفرادیت اور اس کی شناخت تک محدود نہیں بلکہ فرد کو معاشرے میں حقوق کی عدم دستیابی کا تعلق بھی اس سے وابستہ ہے۔شناختی بحران بظاہر کسی فرد کی اپنی ذات سے متعلق کشمکش ہے کہ میں کون ہوں؟ کیسے؟ کیوں ہوں؟اجنبیت،خوف اور اپنی پہچان کیا ہے کہ کیفیت میں مبتلا ہونا ہے۔وہ کون ہے تشخص کا تعین بہت ساری پرتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔جدیدیت کے فروغ کے ساتھ ہی فرد تنہائی ،مایوسی،بے اطمینانی کے کرب میں بھٹکتا نظر آتا ہے اور اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔اور اس کے لیے مایوسی،لاچاری ،بیگانگی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

> شناخت کا مسئلہ فرد کی ذات ہی سے ہی سے شروع ہوتا ہے داخل اور خارج کی کشاکش،اس میں پستا ہوا فرد،فرسٹریشن،غم وغصہ۔۔تمام عوامل اس سے اس کی شناخت چھین لیتے ہیں کون؟ کیسے؟اور کیوں کی گردشوں میں وہ گھوم رہاہے گھر کے اندر باہر شناخت گمشدگی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔[1]

شناختی بحران بے یقینی اور الجھن کا ایسادورانیہ ہے جس میں کسی انسان کی شناخت غیر محفوظ ہو جاتی ہے جیسے طاؤس فقط رنگ ناول کا مرکزی کردار مراد ہے۔مراد پاکستانی تارکین وطن جوڑے کی اولاد ہے جس نے امریکی سرزمین پر آنکھ کھولی۔اسی معاشرے کے مطابق قدم باقدم چلنا سیکھا۔۔مراد اپنی ماں کی طرح کسی قسم کے ناستحلجیا کا شکار نہیں ہے۔وہ امریکہ میں پیدا ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔یہ ایسا کردار ہے جو موجودہ عہد میں جیتا ہے۔امریکہ کو اپنا ملک اور اس کی تہذیب و ثقافت رہن سہن طرز معاشرت کو اپناتا ہے۔انھیں مشاغل کو اپناتا ہے جنھیں مغربی نوجوان اختیار کرتے ہیں۔مراد مردانہ وجاہت کا مالک اور ماں کی طرح محبت کرنے والا ہے لیکن والدین

کی علیحدگی اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے جس سے اس کی شخصیت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ مراد غیر مستقل مزاج انسان کے طور نظر آتا ہے جس کی شخصیت بکھری ہوئے ذہنی انتشار کا شکار ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی کا ساتھ چاہتا ہے وہ اکیلا نہیں رہ سکتا دوسروں کے سہاروں کی تلاش میں سر گرداں رہتا ہے۔

مراد ایک طلاق یافتہ جوڑے کی اولاد ہونے کے ناطے سے ایک مستقل غیر مستحکم کردار کی صورت دکھائی دیتا ہے جو رشتوں کو قائم کرنے اور انھیں سنبھالنے میں کمزور ثابت ہوتا ہے۔[۲]

مراد مرکزی کردار ہونے کے باعث پورے ناول پر چھایا ہوا ہے لیکن یہ کردار نسائی کرداروں کے مقابلے میں کمزور کردار ہے جو مشکل وقت کا اکیلے سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا بہت جلد فزدہ ہو جاتا ہے ہمیشہ کسی نہ کسی نسائی کردار سے مدد چاہتا ہے۔ بچپن میں ماں کے پلو سے چپکا رہنے والا بچہ بڑا ہو کر بھی تنہائی سے خوف محسوس کرنے والا اور کمزور کردار ثابت ہوتا ہے جو کبھی شمع، کبھی ڈی کبھی شیری میں پناہ ڈھنڈ تا ہے۔

مام میں بہت تنہا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے پاس۔ میں اکیلا تھا۔[۳]

عام طور پر دیکھا جائے تو اکثر ہیرو کا کردار ہمیشہ مضبوط اور دوسرے کرداروں پر حاوی اور نڈر ہوتا ہے لیکن مصنفہ نے اس ناول میں مراد کا کرادر روایتی ہیرو سے مختلف پیش کیا ہے۔ محبت کرنے والا ہیرو ہے وفا نبھانا چاہتا ہے لیکن غیر متوازن شخصیت کا حامل ہونے کے باعث زندگی میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ ایک پاکستانی لڑکی جو اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ منتقل ہوئی ہے۔ اس سے شادی کرتا ہے لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ مشرقی معاشرے کی پابندیوں میں پلی لڑکی جب مغربی آزاد خیال معاشرے میں سانس لیتی ہے تو آزاد خیال باغی ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر راستے میں جدا ہو جاتے ہیں۔ مراد والدین کے بکھرتے گھر کے بعد اپنے گھر کے ٹوٹنے کے بعد پھر سے تنہائی کی دلدل میں جا گرتا ہے۔

مراد یوں تو مردانہ وجاہت سے بھرپور خوب رو نوجوان ہے مگر سماجی ونفسیاتی لحاظ سے غیر مستقل مزاج اور ازدواجی رشتوں کا قائم رکھنے میں مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔[۴]

مراد دنیا کی بلند و بالا عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ہزاروں دفاتر میں سے ایک میں ملازمت کرتا ہے۔ جہاں ہر قوم اور رنگ و نسل کے لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ملازمت کرتے ہیں۔ مراد کا بہترین دوست اسفند ہے۔ مراد تارکین وطن کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے سب کچھ امریکہ ہے وہ اپنی تہذیب وثقافت رہن سہن، کلچر، روایات واقدار اور اس زبان سے بھی رغبت نہیں رکھتا جو اسے اپنے آباؤ اجداد سے جوڑے وہ اس شناخت اس تہذیب سے بھی آشنا نہیں جس پر اس کے آباؤ اجداد نازاں ہوتے تھے۔ وہ اپنی امریکی شناخت پر فخر

کرتا ہے۔ اسفند اور اپنی ماں کو ناسٹلجیا کا شکار کہتے ہوئے فخر سے کہتا ہے کہ میں تو امریکن بارن ہوں، بارن ان دایو س اے اور نیو یارک میری جنم بھومی شکر ہے میں کسی ناسٹلجیا کا شکار نہیں ہوں۔ اسفند مراد کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے:

آ نٹی یہ امریکہ میں پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا خون سفید یعنی وہائٹ لوگوں کی طرح ہے۔[۵]

ایسے میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر گیارہ ستمبر پر ہونے والے حملوں کے پیچھے مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہوئے سب کو مشکوک ٹھہراتے ہیں خاص طور پر وہ تارکین وطن مشکلات و مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔

طاؤس فقط رنگ کا ہر کردار خواہ وہ پاکستان سے ترک وطنی کے بعد امریکہ منتقل ہوئے ہوں یا انڈیا، بنگلہ دیش یا چاہنہ یا کسی بھی جزیرے آئے ہوں نائن الیون کے المناک سانحے کے بعد بے شناختی کے کرب میں مبتلا ہوتے ہیں یقین و بے یقینی کی کشمکش میں ہر کردار اپنے وجود کی بقاء کی جنگ لڑتے ہوئے سیاسی و سماجی اندھیروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

مراد ایک محب وطن کردار ہے جو اپنے ملک امریکہ سے محبت اور اس میں رہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ دنیا کی بلند و بالا عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں جاب کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ گیارہ ستمبر کی صبح مراد کے آفس پہنچنے سے قبل ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر فضائی حملے سے بڑے پیمانے پر تباہی ہو چکی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت جہازوں کے ٹکرانے سے زمین بوس ہو گئی۔ مراد فیری کے انتظار میں تاخیر کا شکار ہو گیا۔ آتے ہی جو منظر دیکھتا ہے ناقابل بیان ہے۔ چاروں طرف آگ، دھواں، انسانوں کی چیخ و پکار کے دل ہلا دینے والے مناظر اسے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مراد اسی دکھ و کیفیت سے گزرتا ہے جس سے کوئی بھی امریکن اس سانحے کے پیش نظر گزرتا ہے لیکن اس کا اس سانحے میں زندہ بچ جانا بھی اس کی ذات کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ کیوں کے امریکن کی نظروں میں اس سانحے کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ اور ہر مسلمان امریکیوں کی نظروں میں مشکوک اور مجرم ہے۔ شک و شبے کی وجہ سے مسلمان تارکین کے خلاف سخت سے سخت کاروائی سرانجام دی جاتی ہے جس کی زد میں مراد بھی آجاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد ہر امریکی باشندے کی زبان پر یہی الفاظ ہوتے ہیں۔

یہ مسلمانوں کا ہی کیا دھرا ہے۔ آف کتنی بڑی دہشت گردی کہ ہے۔۔ ان تمام خود کش ٹرسٹ کا تعلق القاعدہ سے ہے۔۔ ان کا لیڈر اسامہ بن لادن ہے۔[۶]

وہ مسلمان تارکین وطن جو اپنا سب کچھ ترک کر کے امریکہ کو اپناتے ہیں۔ اور ان کی آگلی نسلیں امریکہ

میں ہی جنم لیتی ہیں ان کی شناخت امریکہ سے ہی وابستہ ہے۔ لیکن نائن الیون کے دہشت گردانہ حملے کے بعد خاص طور پر مسلمان تارکین وطن امریکہ میں اپنی بسی بسائی زندگی کی بساط کے الٹ جانے کے غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور عدم تحفظ کے کے ساتھ افراد میں شناخت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یوں بھی شناخت کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے جب کوئی فرد اپنے وطن کو ترک کر کے کسی دوسرے معاشرے میں قیام پذیز ہوتا ہے وہاں کی تہذیب و ثقافت اور اپنی تہذیب و ثقافت یعنی دونوں تہذیبوں کے تصادم کے بھی شناختی بحران کا سامنا افراد کو کرنا پڑتا ہے۔ اپنے لیے اس معاشرے میں جگہ بنانا نائن الیون کے بعد بہت مشکل ہو گیا۔ مراد اور سجیلہ نائن الیون کے سانحے کے بعد واک کے لیے جاتے ہیں تو انھیں امریکن لوگوں کی نفرت آمیز نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تلخ جملے اور شدید تنقید کا سامنا کرتے ہیں جو انھیں یہ سوچنے ہر مجبور کرتا ہے ان کا کیا قصور ہے۔ وہ مراد جو امریکہ کو اپنا ملک اپنا محبوب سمجھتا ہے وہ اب امریکیوں کی نظروں میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہے۔

> اسے لگا وہ اور اس کا بیٹا دونوں ہی مجرم اور مسلم دہشت گرد ہوں، غیر ہیں، زندگی کی بساط الٹ چکی تھی۔ امریکا میں جنم لینے والے بھی مجرم اور اجنبی سمجھے جانے لگے تھے۔ [۲]

مراد امریکیوں جیسی سوچ رکھنے والا ایک مسلمان نوجوان کردار ہے۔ جو کسی صورت خود کو امریکیوں سے کم نہیں سمجھتا لیکن گیارہ ستمبر کے بعد زندگی کی بازی پلٹ جاتی ہے۔ مراد کا مسلمان ہونا ہی اسے امریکیوں کی نگاہوں میں مشکوک بنا دیتا ہے۔ ڈی کی طرف سے مراد پر لگایا جانے والا دہشت گردی کا الزام، اور اس کے ردِ عمل میں پولیس کا مراد کے ساتھ تضحیک آمیز رویہ اسے خود کو امریکیوں سے کمتر سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن گیارہ ستمبر کے بعد شناخت کا تختہ الٹ گیا اور یہ شناختی اور دہشت گردی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔

شناخت کا مسئلہ صرف سماجی طور پر فرد کی انفرادیت اور اس کے کردار کی پہچان نہیں بلکہ اس کے حقوق سے بھی منسلک ہے۔ بظاہر شناخت کا مسئلہ میں کون ہوں یا کسی کا ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ کون ہیں ان کی شناخت کے تعین میں بہت ساری جہتیں تہہ در تہہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ مراد کو امریکہ میں پیدا ہونے کی حیثیت سے امریکی شہری تسلیم کرتے ہوئے کسی قسم کے مسائل درپیش نہیں ہونے چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ نائن الیون کے بعد دنیا کو امریکی اور غیر امریکی میں تقسیم کر دیا۔ امریکی تہذیب اقلیتوں کی تہذیب پر حاوی ہو جاتی ہے۔

تاریخ میں بہت سارے ایسے واقعات پیش آئے ہیں جہاں بہت ساری اقوام دہشت گردی کا شکار ہوئیں ہیں۔ اور دہشت گردی کی بھی ہے۔ لیکن دہشت گردی کا الزام محض مسلمانوں پہ لگایا جاتا ہے۔ ناول میں مصنفہ بہت سارے حالات و واقعات کی پیش کش سے مقامی باشندوں کے رویوں میں مسلمان تارکین کے ساتھ شدت

پسندی کا رویہ نظر آتا ہے۔ اس شدت پسندی کے احساس تلے دبے تارکین پر بے وطنی کا احساس غالب آجاتا ہے۔ اپنی زندگیوں کا طویل حصہ امریکی سرزمین پر گزار لینے والوں کی شناخت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی نے اس سے وابستہ تمام ملازمین کو بے روزگار کر دیا۔ لیکن سب سے زیادہ مسائل کا سامنا مسلمان تارکین کو کرنا پڑتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی در حقیقت امریکہ کے لیے بہت بڑا معاشی دھچکا تھا جس نے معاشی بحران کو جنم دیا۔ مسلمان تارکین معاشی بحران کے ساتھ ساتھ شناختی بحران کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے ۔گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد 'ہم' اور 'غیر' کی ایسی تقسیم شروع ہوئی جس میں مسلمان تارکین بے شناخت ہو جاتے ہیں۔ مراد شناختی بحران کے ساتھ معاشی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ مراد کو کسی بھی اچھے ادارے میں جاب مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں جاتی کیوں کہ گیارہ ستمبر کے بعد مراد جب بھی ملازمت کے لیے جاتا ہے اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے دہشت گرد سمجھتے ہوئے شکوک و شبہات کی عینک سے دیکھتے ہوئے مسترد کر دیا جاتا ہے۔

مراد سارا وقت کمپیوٹر پر ملازمت تلاش کرنے میں گزرتا ہے۔ شع اس کی بیوی غریب جاب لیس کہہ کر چھوڑ دیتی ہے۔ مراد کا ملک جس سے وہ بے پناہ محبت کرتا تھا وہ بھی اپنا اور ویسا نہ رہا۔ مراد کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس نے یہی جنم لیا۔ یہی زندگی گزاری لیکن آج وہ بے شناخت کیوں ہے؟ وہ اپنے ہی ملک میں بے شناخت اور مشکوک کیوں ہو گیا ہے؟ اب آگے کیا ہوگا مستقبل کی سوچ عجیب کشمکش میں مبتلا کر کے دوراہے پہ لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں سے آگے کی طرف جاتے راستوں سے وہ نا آشنا ہے وہ راستے اس کے لیے اجنبی ہیں جنھیں اس کے والدین ترک کر آئے تھے۔ وہاں ٹھہرے رہنا بھی آسان نہیں کیوں کے مسلمان ہوتے ہوئے دہشت گرد ہونے کے لیبل سے بچنا گیارہ ستمبر کے بعد مشکل تھا۔

> مسلم، ہندو، سکھ سبھی کو شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا امریکینز کے دماغوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے ایک بے یقینی کی فضا تھی جس کا کوئی انت نظر نہ آتا تھا۔[۸]

کسی بھی معاشرے میں جب ایک سے زیادہ شناختیں قیام پزیز ہوتیں ہیں تو ان کے مابین سیاست کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور تہذیبی و ثقافتی اور سماجی سطح پر ان شناختوں کے درمیان تصادم پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں طاقت ور اکثریت کمزور اقلیتوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتے ہیں ۔ جس سے وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی احساس جرم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جیسے ناول کا مرکزی کردار مراد مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی امریکیوں کے رویوں سے احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان تارکین کردار بے شناختی کی سولی پر لٹکے نظر آتے ہیں۔ مراد کو ذیادہ مناسب

جاب نہیں ملتی مایوس ہو کر ایک گائی نیز جوڑے کے گھر چھوٹے موٹے کاموں اور ڈرائیونگ کی ملازمت اختیار کرتا ہے۔ مراد بھی دوسرے امریکن نوجوانوں کی طرح تاریخ سے لاعلم ہے۔ وہ نہیں جانتا گائی نیز کون ہوتے ہیں۔ گائی بوڑھے جوڑے کی بیٹی جو پڑھائی کے لیے ان سے دور رہتی ہے جب وہ مراد کے بارے میں سنتی ہے کہ وہ پاکستانی مسلمان ہے وہ پریشان ہو جاتی ہے کئی دہشت گرد نہ ہو والدین کو کسی مشکل کا سامنانہ کرنا پڑھ جائے۔

مصنفہ مراد کے ذریعے سے مسلمان تارکین اور ان کی آگلی نسلوں کے بے شناخت ہونے کا نوحہ رقم کرتی ہیں۔ مراد کی ٹیلی فون پر شیری کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے اس بات کا باخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں مسلمان خاص طور پر پاکستانی تارکین کو کس طرح دہشت گرد سمجھا جاتا ہے اور ان کی شناخت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ شیری کا مراد سے مجرموں کی طرح تفتیش کرتی اس کا سوشل سیکورٹی نمبر، آئی ڈی وغیرہ سب دریافت کرتی ہے۔ مراد کا کرمینل ریکارڈ چیک کرنے کے بعد بھی مطمئن نظر نہیں آتی۔

> تم پاکستانی ہو اور پاکستانی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ابھی نائن الیون کا زخم تازہ ہے۔۔۔ ویسے میں F.O,B (fresh the boat) لوگوں پر با آسانی اعتماد نہیں کر سکتی۔[۹]

F.O,B مراد سن کر حیریت میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے اسے کسی نے گالی دی ہو۔ F.O,B یعنی بذریعہ کشتی کسی غریب ملک سے فکر معاش کے لیے آئے ہوئے لوگوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ امریکن بارن ہونے پر فخر کرنے والا مراد اس کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے کہ وہ کیسے اپنی شناخت کروائے اور کوئی اس کی شناخت پر یقین کرئے گا۔ شیری کے جملے مراد کی شناخت پر گہری ضرب لگاتے ہیں کہ اسے اپنا آپ بیگانا لگتا ہے بیگانگی کی یہ کیفیت تاریکی میں چھپے ان پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے جن سے وہ واقف نہیں تھا۔ گیارہ ستمبر کے سانحے نے معاشرے اور تارکین کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل کر دی جہاں سے کردار جھانک تو سکتے ہیں لیکن اجنبیت کی دیوار کو پار نہیں کر سکتے۔ مصنفہ مراد کے دل ہی دل میں آنے والے خیالات سے مسلمان تارکین کی بے شناختی کو عیاں کرتی ہیں۔

> دل میں سوچا۔۔۔ واقعی نائن الیون کے سلگیں اور دھواں امریکا کی یادداشت میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔[۱۰]

اب مسلمانوں کی حیثیت ہمیشہ مشکوک رہے گی۔ اس حقیقت کو قبول کرنا ہی ہو مراد بچوں کی طرح خوف زدہ ہوتا ہے اس کے ذہن میں کہی طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں۔ نائن الیون کا حادثہ کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ کیا واقعی دہشت گرد مسلمان تھے؟ جتنا سوچتا ہے الجھتا جاتا ہے خدشات کا انبار بے چین رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر شناخت کا

مسئلہ کردار کی ذات سے شروع ہو کر سماج تک پھیل جاتا ہے۔ ہم کون ہیں؟ ہماری پہچان کیا ہے؟ کہاں سے ہیں؟بنیادی طور پر تعلق کہاں سے ہے؟ کن نظریات کے حامی اور عقائد کے پیروکار ہیں۔ تارکین وطن کے زوال کا نقطہ آغاز اس کی شناخت کو مسخ کر دینے سے شروع ہوتا ہے اور ان کی شناخت معدوم کر دیتا ہے۔ مراد الجھن کا شکار شناخت کے مسلئے سے ہمکنار ہوتا ہے۔ امریکی معاشرہ جب تارکین وطن کو اپناتا نہیں تو ان سے شناخت کے تمام حوالے چھین لیتا ہے۔ ہم کیا ہیں ہماری شناخت کیا ہے؟سب کرداروں کی شناخت گیارہ ستمبر کے بعد دھندلا جاتی ہے۔ مراد اسی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔

اسے زندگی ایک معمہ لگ رہی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں اور کیوں ہے؟تنہائی کا شدید احساس اور سب سے بچھڑ جانے کا غم اسے ڈاسنے لگا۔[11]

مراد ناول کا مرکزی کردار ہے لیکن ڈی کے سامنے خود کو کمتر اور بے بس محسوس کرتا ہے۔ڈی انجانی طاقت سے اسے اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔ مراد گائی نیز جوڑے کی بیٹی شیری سے محبت کرتا ہے۔ مراد ملازمت کے سلسلے میں شیری سے دور شہر منتقل ہو جاتا ہے جہاں ڈی سے ملاقات نائن الیون اور اسفند کی یاد کے زخم تازہ کر دیتی ہے۔ڈی مراد ہر بعض اوقات اس حد تک حاوی ہو جاتی ہے کہ وہ بے بسی کی انتہاؤں پر کھڑا حیرت سے تکتا ہے۔ڈی میجک پلزذرنگ میں ڈال کر مراد کو جادوائی دنیا کی سیر کرواتی ہے مراد کیسے کیوں اور کیا کی کشمکش میں مبتلا بے یقینی سے ڈی سے پوچھتا ہے۔ مراد اپنے آپ سے بھی ناآشنا ہے وہ سمجھ نہیں پاتا کہ اس کی ضرورت کیا ہے۔اسے کیا چاہیے؟۔ محبت اور تنہائی کے مدار میں تیرتا مراد تنہائی اور اکیلے پن سے خوف محسوس کرتا ہے۔ یہ کیا ہوا؟ کیوں اور کیسے ہوا؟ ایسے سوالات مراد کے ذہن میں مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں، مراد کو تشنگی، ادھورے پن کا احساس داخلی و خارجی سطح پر اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔اپنے آپ سے الجھتا، ملکی سیاسی و سماجی صورت حال کے پیش نظر عدم تحفظ کا شکار مسائل در مسائل میں پھنسا چلا جاتا ہے۔

مراد گھبرا کر مجھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے؟،،، میں صرف شیری کا ہو کر کیوں نہیں جی سکتا؟
اکیلے ہونے سے اتنا خوف کیوں؟۔۔۔ میں کیا ہوں؟
"کیسا انسان ہوں۔[12]

مراد بے بسی کی کیفیت سے گزرتا ہے جہاں وہ اندر سے اس قدر کھوکھلا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات کا احاطہ کرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ مراد تارکین وطن کی اولاد ہونے کی وجہ سے شناخت کے مسئلے سے دوچار ہے ایسی ہی تارکین وطن کی اولادیں جو مکمل طور پر امریکہ میں قیام پزیر رہی جنم لینے والے اسی تہذیب و

ثقافت کا حصہ ہیں لیکن تارکین کی اولادیں ہونے کے باعث گیارہ ستمبر کے سانحے کا بعد انھیں غیر سمجھا جاتا ہے۔ بے شناخت ہونے کا احساس مراد کے مکالموں کے ذریعے مصنفہ باخوبی کرواتی۔ جب ہمیشہ مراد کو اپنا تعارف کرواتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے میں بارن امریکن ہوں اس جملے میں اپنے آپ کو تسلی دینے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش نظر آئی ہے۔

مراد جب ڈی کی گاڑی خراب ہونے پر سیکھوں کی ورکشاپ پر لے جاتا ہے ڈی کے پوچھنے پر بتاتا ہے یہ سکھ ہیں مسلماں کی طرح لیکن ہم دو الگ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جلد ہی وضاحت کرتا ہے داڑھی رکھتے ہیں کہ مجھے ان کے ساتھ نہ سمجھ لیا جائے۔ میں تو امریکی بارن ہوں۔ میرے والدین کا تعلق پاکستان سے ہے۔

مراد مغربی کلچر کی پیداوار آزاد خیال کردار ہے جو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا ہے۔ مغرب کی چکاچوند دنیا میں محو اپنے والدین کی تہذیب و ثقافت سے ناآشنا ہے۔ گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد مراد اور اس کی طرح کے پیدائشی مسلمان تارکین امریکن بے شناخت ہو کر چکنا چور خوابوں کے ساتھ دوراہے پہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈی مراد کی طرف سے دھتکارے جانے کے بعد جھوٹی شکایت درج کرواتی ہے۔ جس کی وجہ سے پولیس والے سے پکڑا کر سخت انداز میں وارننگ دیتے ہیں۔ ڈی امریکن عورت ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھااور سزا مراد کو بھگتنا پڑتی ہے۔ مراد کے تمام اکاؤنٹ فیس بک، میل اکاؤنٹ سب کو وہ اپنے استعمال میں لے آتی ہے۔ ڈی اپنی ذاتی خواہش مراد سے پوری نہ ہونے پہ مراد پر دہشت گردی کا الزام لگا دیتی ہے مسٹر چین کے تحفے کے طور پر پرانی صندوق میں پرانے ہتھیار کے بجائے نئے ہتھیار بر آمد ہوتے ہیں جو نا جانے کب ڈی رکھوا دیتی ہے۔ پولیس کا مراد کو بنا کسی تحقیق کے دہشت گردی کے الزام میں فوری طور پر گرفتار کر لینا امریکیوں کی مسلمان تارکین کے خلاف نفرت اور ان کی مشکوک ہوتی شناخت کا بیانیہ ہے۔

مصنفہ اس واقع سے مسلمان تارکین وطن کی اولادوں کی بے وقتی اور ناقدری کو بیان کرتی ہیں۔ جن کی کوئی شناخت اور مغربی معاشرے میں حیثیت گیارہ ستمبر کے بعد نہیں رہتی۔ سجیلہ کہتی رہ جاتی ہے کہ میرے بچے امریکہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ میرا بیٹا دہشت گرد نہیں ہے لیکن اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ دہشت گردی کا الزام وہ بھی مسلمان تارکین کی اولاد پر ان کی بسی بسائی زندگیوں کی بساط کو الٹا کر رکھ دیتا ہے۔ کل تک جو مراد امریکہ کے گیت گاتا تھا اس ملک کا باشندہ ہونے پر فخر کرتا تھا اب اس کی شناخت دہشت گرد کے طور پر ہوتی ہے۔ تارکین وطن کی اولادیں سیاسی و سماجی طور پر شدید متاثر ہوتیں ہیں۔ ہتھکڑیوں میں جھگڑے مراد کو اس وقت امریکن بارن تو کیا ایک

انسان بھی نہیں سمجھا جا رہا تھا۔

> پاؤں میں بیڑیاں پہنے برف میں قدم جماتا دھیرے دھیرے چل رہا تھا ہتھکڑیوں میں بندھی لوہے کی زنجیر کا ایک پولیس آفسر نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا سجیلہ کو لگا اس وقت اس کا بیٹا کتے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ [۳۱]

مراد کی حیثیت امریکن آفیسر کی نظروں میں انسان کی بھی نہیں نظر نہیں آتی۔ مراد کو چھوٹے سے کوٹھری نما سیل میں قید رکھا جاتا ہے۔ جہاں بیڑیوں سے جکڑے پاؤں رگڑ سے سرخ ہو جاتے ہیں۔ مراد کے پاؤں پر سرخ داغ درحقیقت مراد کی شناخت پر لگے داغ ہیں جو نہ دھل سکتے ہیں نہ مٹ سکتے ہیں۔ بلکہ وقت کے ساتھ یہ داغ اور بے شناختی کا احساس مزید گہرا ہوتا ہے۔ سرخ پاؤں اس کی بے بسی کو بیان کرتے ہیں۔ قیدی مراد کو مسلمان دہشت گرد کہہ کر چھیڑتے ہیں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں مصنفہ کردار کی بے شناختی اور کردار اور معاشرے کے درمیان بیگانگی اور اجنبیت کی حائل دیوار کی منظر کشی کرتی ہیں۔

> قیدیوں نے مجھے دہشت گرد پکار کر چھیڑنا، مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ مسلم ٹیررسٹ کہہ کر تھپڑ جڑ دیتے۔ میں نے کہا بارن امریکہ ہوں تو انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ [۳۲]

اپنی امریکن شناخت پر فخر کرنے والا مراد بے شناختی کے اس دوراہے پر کھڑا ہے جہاں نہ خود کو امریکن کہہ سکتا ہے اور نہ ہی خود کو پاکستان کے ساتھ وابستہ کر پاتا ہے۔ خود کو امریکن بارن کہنے پر امریکن باشندوں سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مراد پیدائشی امریکن لیکن اپنی براؤن چمڑی کو سفید نہیں کر سکتا۔ رنگ و نسل کا تضاد مشرق و مغرب سے کے امتیازات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مراد کے زریعہ مصنفہ مسلمان تارکین وطن کو امریکہ میں گیارہ ستمبر کے بعد درپیش مسائل خوف،، بے بسی، کرب، عدم شناخت کا مسئلہ ،مایوسی، اجنبیت، تنہائی کا احساس ہر کردار میں پنپتا ہے۔ جو انھیں اپنی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

آخر میری شناخت کیا ہے؟ وطن کون سا ہے؟ معاشرے کے قبول اور رد کرنے کی وجہ؟ مراد جس تعصب کا سامنا قید میں کرتا ہے اس سے اس کے سامنے مغرب کا بدلا ہو وہ روپ عیاں ہوتا ہے جس کے آئینے میں وہ اپنی شناخت دھندلی ہوتی محسوس کرتا ہے۔ جس کا اظہار مراد اپنے دوست گریگوری کے سامنے کرتا ہے۔ اس کی طرف سے ملنے والا جواب اسے سوچ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ ملک ہمارا نہیں صرف وائٹ یعنی گوروں کا ہے انھوں نے بھی ریڈ انڈیز سے چھینا تھا یہاں براؤن اور بلیک پر گوروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

وہ ہمیشہ دوسروں پر اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا ہے۔ کچھ صدیاں پہلے تک وہ گوروں کے علاوہ کسی کو انسان

نہیں سمجھتے تھے۔ ایسی سوچ کا تصور بھی مراد کے لیے اذیت ناک ہے۔ مراد بھی ہر امریکی نوجوان کی طرح مسلمانوں کو فساد کی جڑ سمجھتا تھا نہ خود امن سے رہتے ہیں نہ دوسروں کو امن سے رہنے دیتے ہیں۔ دہشت گردی کیوں کرتے ہیں لیکن اب اس کی جڑیں خود امریکہ سے اکھاڑی جا رہی تھیں۔ بے شناختی کا احساس اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دہشت گرد نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم کی طرح خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ نائن الیون کو وقوع پزیز ہوئے کافی وقت بیت جانے کے بعد بھی امریکی میڈیا ہر بری خبر اور دہشت گردی کے واقعے کو نائن الیون اور مسلمانوں سے جوڑتا ہے۔ وائٹ اور براؤن چمڑی کے کیس کے دوران پلڑا وائٹ چمڑی کا بھاری ہوتی ہے۔ مراد کا آل امریکن ہونے کا خواب بری طرح ٹوٹتا ہے اور اس پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ گورا نہیں ہے لہذا اسے گوروں جیسی ترجیحات حاصل نہیں ہو سکتی ہیں۔ اب وہ اس دوراہے پہ کھڑا ہوتا ہے جہاں سے آگے بڑھنا یا رکھنا دونوں محال ہے ساری زندگی جس خواب کو دیکھا وہ محض دکھاوا ہے جس میں کوئی حقیقت نہیں۔ بیگانگی اور بے شناختی کی اذیت سے دوچار مراد یہ سوچتا ہے کہ وہ جائے تو کہاں جائے۔

> آل امریکن ہونے کا خواب کس بری طرح ٹوٹا۔۔ اس کو گوروں جیسی ترجیحات نہ مل سکتی تھیں،، مگر اب وہ اس مقام پر تھا کہ کسی بھی نئی دنیا میں جا کر بس نہیں سکتا تھا ۔۔ گورے امریکن مسلمان کو ہر وقت کہتے رہتے تھے اپنے ملک لوٹ جاؤ مگر امیگر نیشن کا اپنا ملک کون سا تھا ان کو خود خبر نہ تھی۔[۱۵]

مراد عدم تحفظ کا شکار دروازے پر ذرا سی دستک سے بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ کوئی مصیبت نہ ہو۔ اپنے ملک میں اجنبیت احساس کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانے کا خوف رہتا ہے۔ شناخت کا تعلق طاقت کے احساس کے ساتھ گہرا ہے۔ مراد کشمکش میں مبتلا سوچتا ہے میں ایک حقیقی جیتا جاگتا انسان ہوں یا سکرین پر چلنے والی فلم کا کردار بے یقینی کی کیفیت میں اپنی ذات کی بے شناختی سے متعلق سوال اٹھاتا ہے۔

> مراد کو لگتا وہ ایک حقیقی انسان نہیں، کسی فلم کا ایک کردار ہے۔۔۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔[۱۶]

مسلمان اور دہشت گرد دو ایسے الفاظ ہیں جب بھی ساتھ استعمال ہوتے ہیں امریکی لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا لازمی امر بن جاتا ہے۔ تارکین بنا کسی جرم کے خود کو مجرم سمجھنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی شناخت اور شخصیت دونوں بری طرح متاثر ہو جاتی ہیں۔ بے یقینی اور بے اعتمادی کی فضا میں سانس لیتے تارکین وطن اندرونی گھٹن، عدم تحفظ اور تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مراد ان حالات و واقعات سے تنگ آ کر ماں سے کہتا ہے

آپ لوگ امریکی آئے ہی کیوں تھے؟۔۔۔اب یہ ہمارا ملک ہے۔ہم اس سے پیار نہ کریں تو اس ملک سے کریں۔'آخر ہم کہاں جائیں"۔[۱۷]

آہستہ آہستہ مایوسی اور ڈپریشن کی کیفیت میں مبتلا ہو کر سوچتا مسلم نہ ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار اور بے شناخت نہ ہوتا وہ شیری سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ جب بچے ہوں نہ گورے نہ کالے نہ براؤن ہوں ملے جلے چائنیز نقوش ہوں۔اور ہمارا بھی مستقبل محفوظ رہے۔ مراد کا اس حد تک سوچنا کہ کاش وہ مسلمان اور براؤن نہ ہوتا بلکہ انگریز ہوتا اس کی زندگی میں درپیش مسائل کی عکاسی کرتا ہے جو اسے مسلمان اور براؤن ہونے کی وجہ سے درپیش ہیں۔مراد بے بسی اور بے یقینی کی کیفیت میں سوچوں کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے جہاں اسے اپنا آپ شیشے کی چار دیواریوں میں قید محسوس ہوتا ہے۔جہاں وہ سب دیکھ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے لیکن کسی کو چھو نہیں سکتا۔ذہنی ناآسودگی، داخلی گھٹن، بے یقینی اور بے اعتمادی کے باعث مراد کو عدم تحفظ کا احساس رہتا ہے جو اسے کم تر درجے کا شہری بنا دیتا ہے۔وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا وہ کبھی نارمل زندگی گزار پائے گا۔ مسز ثناء رشید مراد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتی ہیں۔

مراد کا کردار بے یقینی اور کم مائیگی کا احساس لیے ہوئے ہے وہ زندگی کی مشکلات کو اکیلا جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔[۱۸]

طاؤس فقط رنگ امریکی پس منظر میں کرداروں کے شناختی بحران کا نوحہ ہے۔نسائی کرداروں میں مرکزی اور سب سے طاقت ور کردار ڈی کا ہے جس کا اصل نام ڈیلائلہ تھامس ہے جو رلڈ ٹریڈ سنٹر میں اکاؤنٹینٹ کی جاب کرتی ہے۔ جہاں اس کی دوستی مراد اور اسفند سے ہوتی ہے وہ عام عورتوں سے مختلف ہے کبھی بھی کچھ بھی کر گزرنے والی نڈر بے باک لڑکی ہے۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے وقت وہیں موجود ہوتی ہے جو معجزیاتی طور پر زندہ بچ جاتی ہے۔ڈی جنونی اور کسی حد تک نفسیاتی مسائل سے دوچار نظر آتی ہے۔ڈی مغربی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے وہ ہر چیز پر اپنا حق سمجھتی ہے جو نہ ملے اسے چھین لینے کی قائل ہے جائز ناجائزہ طریقے سے اپنی پسند کی ہر شے حاصل کر لینا چاہتی ہے۔

ڈی کی پیدائش گیانا میں ہوئی جو ایک بہت خوبصورت جزیرہ ہے جہاں کیلی فورنیا سے تعلق رکھنے والے ایک شخص جم جونز کمیونٹی آباد کرتا ہے جہاں کمیون کو آزادانہ جنسی تعلقات پر اکساتا ہے۔ڈی جم جونز اور سو کی ناجائز اولاد ہے جسے سو کبھی تسلیم نہیں کر پاتی۔ جم جونز کی طرف سے ڈی کو دیئے جانے والا نام میری گولڈ ہے سی آئی ڈی والے کمیون کی شکایات پر گیانا پہنچتے ہیں سو اور لیو وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ہیلی کپٹر کے پاس جاتے ہیں

میری گولڈ سو کی گود سے پھسل کر جنگل میں بھاگ جاتی ہے۔فیول کم ہونے کے باعث وہ زیادہ دیر نہیں رکتے نہیں میری گولڈ وہی رہ جاتی ہے۔اور جم جونز میری گولڈ کا باپ خود کشی کر لیتا ہے۔میری گولڈ جس کی موجودہ شناخت ڈی کے نام سے وہ میری گولڈ کی بھیانک حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔اس کی پرورش ایک بے اولاد عیسائی جوڑے نے کی۔

> ہر کردار اپنی معصومیت اور بے بسی کے ہاتھوں مجبور ہے جبلت کا جبر ،بقاء کا کرب بہر طور اس کا مقدر ہیں اس پر احساس زیاں،ادراک اور آگہی کا عذاب اسے شدت پسندی اور انتقام کے جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔وہ جس بھی رنگ، نسل اور پس منظر سے ہے اپنے ہم سیارہ سے کٹا ہوا،بٹا ہوا، منقسم ہے۔اپنے ازل کی تلاش میں گرداں اپنی شناخت کھوجتا پھر سے جوڑنے کا آرزو مند،حسرت زدہ ہے۔[19]

انسان پیدائش کے ساتھ ہی اپنے وجود کی بقاء اور اپنی شناخت چاہتا ہے۔ڈی بھی اپنی شناخت چاہتی ہے مراد کی نیوروشل میں جاب کے دوران نائن الیون کے بعد پھر سے ملاقات ہوتی ہے۔مراد کے ساتھ شیری کے گھر جاتی ہے اس کے گھر کی ویڈیو جب اپنی ماں جولیا کو دکھاتی ہے وہ حیرت سے مجسمہ بنی وہی ساکن رہ جاتی ہے۔ماں ڈی کی شیری کی فیملی سے میل ملاپ سختی سے منع کرتی ہے۔یہاں سے ڈی کے شکوک وشبہات کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔آخر اس فیملی سے نہ ملنے میں کیاراز پوشیدہ ہے وہ اس چھپی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لینڈ لائن فون پر ریکارڈنگ ٹیپ سیٹ کرتی ہے۔ماں اور اس کے بھائی کے درمیان ڈی کے بارے میں ہونے والی گفتگو اس پر حیرت کے پہاڑ توڑ دیتی ہے۔جس کے نیچے اس کا فخر اس کی شناخت دب جاتی ہے۔وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگتی ہے یہ سب جاننے کے بعد بھی وہ ہمت ہارتی نہیں بلکہ اپنی اصل کو جاننا چاہتی ہے۔اپنے اصل ماں باپ کے بارے میں جاننے کی جستجو کرتی ہے۔ٹیپ سن کر اس کا ذہن ہچکولے لینے لگتا ہے وہ عجیب تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے جیسے پوری دنیا میں وہ تنہا ہو۔اپنی شناخت سے متعلق اس کے ذہن میں بے شمار سوالات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود تھا۔

تقدیر کا اس کے ساتھ یہ اتنا بڑا مذاق اس کے لیے ناقبل برداشت ہے وہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا سوچتی ہے۔اپنے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بن ماں باپ کے پالی ہوئی لڑکی ہے جو اپنی ذات پات ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی وہ ایک بے شناخت اپنی اصل سے ناآشنا سوچتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے میری پوری زندگی محض فریب ہے۔وقت کی گرد میں چھپی حقیقت اور ماضی کے نقش تلاش کرتی ہے ماضی کو یاد کرتی ہے لیکن حقیقت کا کوئی نقش اس کے ذہن میں نہیں ابھرتا اور یہ خالی پن اس کی شناخت کا مسئلہ بنتا ہے۔

کیا کوئی میرا نہیں؟

کیا پتہ میرے حق میں یہی بہتر ہو۔۔ نہیں میری ساری زندگی ایک فریب، ایک مفروضہ

ہو یہ میرے لیے کیسے بہتر ہو سکتا ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا اپنے لیے، اپنی زندگی،

اپنی حقیقت کے لیے۔۔ میرا دل کٹ کیوں رہا ہے؟

میری ذات ٹکرے ٹکرے ہو رہی ہے

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑ رہا؟ [۲۲]

ڈی پر جب یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جنھیں وہ ماں باپ سمجھتی رہی تا عمر وہ اس کے ماں باپ نہیں بلکہ وہ ایک لاوارث گود لی ہوئی بیٹی ہے جسے گیانے کے ویرانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ گیانا کے جنگلوں میں بھٹکتی بڑی ہو کر بے شناختی کے احساس کے ساتھ تنہائی کا احساس دوہری اذیت سے دوچار کرتا ہے۔ جس سے بجات پانے کے لیے وہ نشہ آور گولیوں کا استعمال کرتی ہے جنھیں وہ تنہائی کی پین کلر کہتی ہے۔ وہ مراد سے اپنی تنہائی کا اظہار کرتی ہے وہ پوری دنیا میں خود کو تنہا سمجھتی ہے جس کی شناخت کسی دھندلے سائے میں لپٹی ہو جس کی تلاش اسے سرگرداں رکھتی ہے۔ مصنفہ ڈی کے کردار کے زریعے فرد کی تنہائی کو موضوع بناتی ہیں۔ ڈی اندرونی کش مکش اور توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرتی ہے لیکن باہمت کردار ہے جو مصیبت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

ڈی ایک بے چین اور سکون سے عاری کردار ہے جو تنہائی میں خود سے باتیں کرتی کبھی ہنستی ہے تو کبھی رو بھی دیتی ہے لیکن وہ اپنے اندر کی بے چینی کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتی۔ داخل اور خارج کی متضاد کیفیت سے گزرتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق جاننے کی جستجو کرتی ہے۔

اس ناول کا سب سے مضبوط کردار ڈی کا ہے جو ایک جادوائی طاقت رکھتی پر اسرار شخصیت کی حامل ہے۔ جب وہ سیٹی بجاتی ہے تو اس کی جادوئی کشش میں مراد اپنا آپ کھونے لگتا اور مدہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جسے ڈی جنت کی سیر کہتی ہے۔ مراد کی طرف سے محبت سے انکار ڈی ہضم نہیں کر پاتی آسانی سے حاصل نہ ہونے پر زبردستی کی کوشش کرتی ہے ناکامی کی صورت میں انتقامی آگ میں جلتی ہوئی مراد کا سارا سسٹم ہیک کر لیتی ہے اس کے بارے تمام معلومات رکھتی ہے ناول میں کچھ ایسے واقعات ڈی سرانجام دیتی ہے جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ڈی اور مراد دونوں ہی ایسے کردار ہیں جو امریکہ میں پرورش پانے کے باوجود دونوں کردار اپنے خاندان سے علیحدگی اور توڑ پھوڑ کے باعث نفسیاتی مسائل کا شکار نظر آتے ہیں۔

مصنفہ نفسیاتی مسائل کا باخوبی ادراک ہے۔ اس کی جھلک ناول میں نظر آتی ہے۔ مراد اور ڈی کی نفسیات کو

خاص طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مراد عورت کے بغیر اور ڈی مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی دونوں کی کمزوری جنس ہے جس کی وجہ سے وہ بہت سارے دوسرے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ ٹھکرائے جانے کی اذیت کا بدلہ لینے کے لیے مراد پر دہشت گردی کا الزام لگاتی ہے ڈی بچپن میں والدین کی طرف سے ٹھکرائے جانے اپنی زندگی کی بساط الٹ جانے سے وہ جس کرب سے گزرتی ہے مصنفہ بہت عمدگی کے ساتھ ڈی اور ماں جولیا کے درمیان مکالمے کی صورت میں پیش کرتی ہیں۔

لوگ کیوں چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی مائیں کیوں بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں؟ آخر کیوں؟ سب مجھے چھوڑ جاتے ہیں۔ [۲۱]

ڈی ماں جولیا سے سوال کرتی ہے آخر تم نے مجھے اکیلے کیوں نہ چھوڑا اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے اپنی جڑوں سے اکھڑے بے شناخت ہونے کی داستان سناتے ہیں۔ وہ اپنی اصل جاننا چاہتی ہے اپنے بے شناخت اور لاوارث ہونے کا احساس اسے بے چین کرتا ہے۔ بے جڑ ہونے کا غم، مسرت اور سکون کی تلاش، بے شناخت ہونے کا غم، رشتوں سے بچھڑنے کا غم براہ راست ڈی کی شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔

ڈی اپنے ماضی سے لاعلم مگر ماضی کی کھوج جاری رکھتی ہے جس کے لیے وہ شیری کی ماں جو کہ درحقیقت ڈی کی ماں ہے اسے اغوا کر لیتی ہے ڈی اپنی ماں کی محبت پانا چاہتی ہے اپنے وجود کی شناخت چاہتی ہے۔ ٹیپ ریکارڈنگ سنانے کے ماں سے اپنے باپ کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ گیانا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوال کرتی ہے۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے میری گولڈ سے ڈیلا نکہ تھامس اور پھر ڈی کو اجنبیت اور بیگانگی سے دیکھتی ہے۔ یہاں تک کا سفر بے شناختی کا سفر ہے۔ جو تک کا سفر ہے۔ اسے غیر مستقل مزاج بنا دیتا ہے اس کا مزاج کبھی سرد کبھی گرم بعض اوقات محبت کی دیوی کا روپ دھار لیتی ہے اور جب انتقام لینے پر آتی ہے تو ظالم چڑیل معلوم ہوتی ہے۔ کبھی ظالم اور کبھی مظلومیت کا لبادہ پہن لیتی ہے۔

وہ اغوا کر کے لائی ماں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتی ہے۔ کبھی بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے کبھی گھٹیا اور خودغرض کہتی ہے۔ ڈی اپنی جڑوں سے جدا والدین کی چھوڑی ہوئی بیٹی مسلسل مبتلائے کرب میں بکھرتی چلی جاتی ہے۔ وہ احساس تنہائی کا مقابلہ بھی کرتی ہے اور فرسٹریشن کا شکار ہو کر نشہ بھی کرتی ہے جس سے اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ ڈی نفسیاتی اور شناختی بحران کا شکار کردار ہے جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔ اس کے ذہن میں ماضی کے دھندلے خدوخال ہیں اس پر کچھ واضح نہیں ہے ہوتا۔ اصل والدین کے چہرے کے نقوش تک اس کے ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔ اس دھند میں وہ اپنا ماضی کھو چکی ہے۔ لیکن وہ مایوس ہو کر ہمت ہار کر بیٹھ جانے

والی کمزور کردار نہیں ہے۔ بلکہ اپنی شناخت اپنے اصل کے بارے میں جاننے کی تلاش و جستجو میں سر گرداں عمل رہتی ہے۔

میجک رئیل ازم کی جھلک ناول میں نظر آتی ہے۔ ڈیلا ٹکہ وہ حیران کن کردار مراد ہے جو ناول اور قاری کو سحر میں جکڑ لیتی ہے ایک جادوئی کشش رکھتی ہے ۔ڈیلا ٹکہ جب مراد سے الجھتی ہے تو وہ بہت سارے پر اسرار واقعات کو جنم دیتی ہے۔ ڈی طاقت ور لیکن تنہائی کا شکار ہے اور اس کی یہی تنہائی عدم شناخت کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

> ڈیلا ٹکہ ایک نفسیاتی مریضہ کی صورت انتہائی پر سوز اور ان سیکیور نظر آتی ہے۔ اور اپنی بچپن کی گم شدگی کو اپنے ماں باپ کی طرف سے ریجکشن سمجھ کر اپنی ہر خواہش کو اپنا پیدائشی حق سمجھ کر بے دردی سے حاصل کرنے میں لگ جاتی ہے۔ [۲۲]

ڈی اور ماں کے درمیان ایک بار پھر سے ہیلی کپٹر آگیا گیانا چھوڑتے وقت ہیلی کی آمد اس روز ڈی اور ماں کے بیچ جدائی اور بے شناخت جنگلوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا اب ہیلی پھر اس کے اور اس کی ماں کے بیچ آگیا۔ ڈی بے شناختی سے شناخت کے سفر میں موت کی نیند سو گئی۔

شیری گائی نیز جورے مسٹر چین اینڈ مسز چین (قمر النساء) کی بیٹی ہے۔ جس کی پیدائش گیانا میں ہوئی در حقیقت وہ مسز چین کی بیٹی نہیں ہے۔ بلکہ مسٹر چین جن (لیو) اور سلوریا جو کہ گیانا میں ایک اپاہج عورت تھی اس کی بیٹی ہے۔ گیانا میں جم جونز کے قوانین کے مطابق زبردستی سب کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔۔ ڈی اور شیری بھی اسی جنسی زیادتی کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ جم جونز شیری کا 'انجلیکا' رکھتا ہے۔ گیانا ٹریجڈی سے زندہ بچ کر جانے والوں میں سو اور لیو بھی ہوتے ہیں جو بیٹی انجلیکا کے کو ساتھ لے کر نیو یارک کے کوئز یورو میں واقع ہل سائیڈ ایونیو آجاتے ہیں۔

جہاں ایک بار کمیون کو بے شناخت کر کے جم جونز نے اپنی مرضی کی شناخت عطا کی ایک بار پھر وہاں گیانا چھوڑ کر بے شناخت ہوئے اپنی اصل شناخت چھپاتے ہوئے نام بدل کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

گیانا چھوڑ کر انجلیکا کو بھی نئی شناخت ملی وہ بھی ڈی کی طرح ساری زندگی جسے ماں سمجھتی ہے وہ اس کی ماں نہیں ہے۔ شیری اپنی زندگی کی کئی حقیقتوں سے آگاہ نہیں۔ انجیلکا سے شیری تک کا سفر گیانا ٹریجڈی سے نیو یارک میں قیام کی دوہری شناخت کا قصہ اور بے شناختی کا سفر ہے۔ شناخت کا تعلق صرف فردِ واحد کی ذات سے ہی نہیں ہوتا بلکہ بہت سارے عوامل ہوتے ہیں جو مل کر کسی فرد کو شناخت عطا کرتے ہیں یا بے شناخت کر دیتے ہیں جیسے رنگ و

نسل، تہذیب و ثقافت، جغرافیہ، نام، لباس، زبان مذہب، روایات و اقدار، تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ شیری اپنی جائے پیدائش چھوڑ کر نیویارک میں آکر اپنے جغرافیہ اور تہذیب و ثقافت سے کٹ جاتی ہے بلکہ اسے نئی شناخت اور نام ملتا ہے۔ وہ ناسٹلجیا کا شکار نہیں ہے کچھ چائنیز اور کچھ ملے جلے نقوش والی شیری مضبوط کردار کی مالک ہے۔ ماں مسلمان خاتون ہے جبکہ باپ عیسائی ہے دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے والدین کی اولاد ہونے کے ناطے شیری کا رجحان کسی بھی ایک مذہب کی جانب نہیں ہے بلکہ وہ آزاد خیال نیویارک میں بسنے والی لڑکی ہے۔

لیکن عام امریکن لڑکیوں سے مختلف اپنی فیملی سے وابستہ ہے۔ شیری کیلیفورنیا میں پڑھتی ہے۔ والد کی وفات کے بعد کولمبیا یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ شیری ناول کے مرکزی کردار مراد کی محبت ہے۔ مراد، ڈی، شیری محبت، حسد، نفرت، انتقام اور بے شناختی کے مدار میں تیرتے یہ کردار اپنی اصل سے دور ہیں۔ جہاں گیارہ ستمبر کے سانحے کے پیش نظر مراد بے شناختی کا شکار ہوتا ہے۔ اسے شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اسی طرح گیانا ٹریجڈی میں شیری اور ڈی اپنی اصل شناخت کھو دیتی ہیں۔ نہ صرف شناخت بلکہ اپنے سگے رشتے اپنے نام بھی چھین جاتے ہیں۔ شیری اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ وہ مہر النسا کی بیٹی نہیں بلکہ معذور سلویا کی بیٹی ہے۔ شیری بھی دوسرے کرداروں کی طرح اپنی جڑوں سے کٹی ہوئی ہے۔ ماں مراد کے کہنے پر بتاتی کہ ہمارے آباؤاجداد کا تعلق ہندوستان سے ہے شیری حیرت سے جواب دیتی ہے۔

> مام کیوں مذاق کر رہی ہو۔ کہاں گیانا۔۔۔ کہاں ہندوستان، بلکہ پاکستان ہم بھلا ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔[۲۳]

تاریخ انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ کون ہے اس کا تعلق کہاں سے ہے۔ شیری باوفا محبت کرنے والی مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔ جو ہر مشکل حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

> ڈیلائکہ کے علاوہ شیری، سجیلہ اور کنول مضبوط اعصاب کی مالک خواتین ہیں وہ وقت اور حالات کے ساتھ خود کو ہر طرح کے ماحول میں ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔[۲۴]

شیری دو مختلف تہذیبوں کے حامل والدین کی بیٹی ہے۔ دنیا کے ہر خطے کے لوگوں کا رہن سہن سماجی اقدار، روایات تہذیب و ثقافت مختلف ہوتی ہے۔

سجیلہ ایک پاکستانی عورت ہے، وہ سہانے خواب سجائے اپنے شوہر کے ساتھ اپنا وطن ترک کر کے امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتی ہے۔ شوہر سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث دو بچوں بیٹی کنول اور بیٹا مراد کی پیدائش کے بعد علحیدگی ہو جاتی ہے۔ سجیلہ تعلیم یافتہ جرنلزم کے شعبے سے تعلق رکھنے والی باشعور عورت ہے لیکن ازدواجی

زندگی کی ناکامی اسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ کبھی پاکستان اور کبھی بچوں کی خاطر امریکہ میں قیام پزیر ہوتی ہے ماں اور بچوں کے درمیان ملاپ اور جدائی کے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ بطور ماں وہ بچوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتی ہے لیکن وہ مشرقی روایتی ماں سے مختلف ہے جو بچوں پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتی۔ اپنی خواہشات کی دبی دبی سسکیوں تک جلدی جلدی کسی کو رسائی نہیں دیتی۔ وہ بچوں کو مشورہ دیتی ہے لیکن دخل اندازی نہیں کرتی دھونس جماتی ہیں۔ سجیلہ ایک باشعور مضبوط تھی جسے طلاق کے دھچکے نے اس نے شناخت اس کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیا۔ وہ محض ایک کمزور ماں نظر آتی ہے۔

> وہ شوہر کی چھوڑی ہوئی اور مالی حیثیت میں کمتر محض ایک ماں تھی۔ علیحدگی کا حادثہ عورت کا سارا اعتماد چوس لیتا ہے۔ وہ خود کو خواہ مخواہ غلط اور مجرم محسوس کرنے لگتی ہے۔ خواہ وہ قصوروار ہو یا نہ ہو۔ اسے آج تک نہیں پتا چل سکا تھا کی اس کا قصور کیا تھا۔ اپنی ہستی، اپنی روح، اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کو دفن نہ کر سکنا کیا واقعی ایک ناقابل تلافی جرم تھا؟[۲۵]

سجیلہ مضبوط شخصیت کی حامل عورت جس کی شناخت اب محض چھوڑی ہوئی عورت ہے۔ وہ اس بات سے ناآشنا ہے کہ اسے کس جرم کی سزا دی گئی۔ اپنی صلاحیتوں کو دفن نہ کر پانا اپنی انفرادی شناخت چاہنا اس کے نزدیک ایسا جرم نہیں تھا بلکہ یہ اس کا حق ہے لیکن عورت ہونے کی وجہ سے اس کے حق کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اسے ہی باغی قرار دیا جاتا ہے۔ سجیلہ صنفی شناختی بحران کا شکار بھی ہے۔ وہ بیٹے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس سوچ میں مبتلا رہتی ہے کئی بہو یہ نہ سمجھ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کو سنبھال لیا ہے۔ بنا کسی جرم کے خود کو مجرم سمجھنے لگتی ہے۔ بہو سے متعلق اس کے ذہن میں بہت سارے سوالات ہیں جن کے جوابات وہ جاننا چاہتی ہے لیکن اپنے سوالات کو زبان پر نہیں لاتی کئی اسے روایتی طنز و تنقید کے نشتر برسانے والی روایتی ساس نہ سمجھ لیا جائے۔ دوہری شخصیت کی مالک ہے بظاہر پر سکون لیکن اندر ابلتا ہوا لاوا ہے جسے انجانے خوف کے تحت دبائے رکھتی ہے۔ سجیلہ احساس کمتری میں مبتلا ہر قدم بہت سوچ بچار کر کے رکھتی ہے۔ وہ خود کی شناخت کھو کر محض دونوں بچوں کی محبت کرنے والی ماں کے طور پر ابھرتی ہے۔ وہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتی ہے مشکل حالات میں بچوں کا سہارا بنتی ہے۔

> سجیلہ تو بس ایک ماں تھی، محبت اور جذبوں کی بھری ہوئی پوٹلی۔ تمام اختیارات سے عاری۔[۲۶]

سجیلہ دوہرے معیارِ زندگی کو اپناتی نظر آتی ہے۔ وہاں امریکہ میں رہتے ہوئے بھی ماضی کی یاد کو سینے میں بسائے رکھتی ہے ماضی کی یاد ہمیشہ اسے ستاتی ہے۔ ترک وطنی کے باوجود سجیلہ کا اپنی تہذیب اپنے ملک سے مضبوط

اور گہرا تعلق ہے۔ وہ امریکی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی پاکستان کو یاد کرتی ہے یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر فرد اپنی جائے پیدائش سے محبت کرتا ہے وہ کبھی گزرے وقت کی یادوں کو دل سے مٹا نہیں پاتا حال سے ماضی کی یاد میں ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے وطن کی یاد ایسے ہی تڑپا دینے والی ہوتی ہے۔ سجیلہ دونوں معاشروں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ سجیلہ اپنے مرکز سے ہٹ کر دو دنیاؤں میں سفر کرتی ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے لیکن امریکی معاشرے سے پر امید دکھائی نہیں دیتی۔ امریکی معاشرے سے بے اطمینانی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں

> یہ امریکہ بھی کیا ملک ہے کسی کو چین یا قرار نہیں سب کچھ ہونے کئی باوجود یہاں لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔[۲۷]

سجیلہ دیار غیر میں رشتوں سے بچھڑی ہوئی عورت شناختی بحران کے باعث پیدا ہونے والی بے چینی اور مایوسی کے بوجھ تلے دبی احساس کمتری میں مبتلا ہے۔ کردار جب تنہائی، بے اطمینانی اور شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کی حیثیت کو دبایا جاتا ہے تو وہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ سجیلہ تغیر و تبدیل کی زد میں تہذیب، سماجی اقدار، غرض ہر شعبۂ زندگی کو مغربی طرز میں اپنانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اپنی تہذیب اپنی روایات و اقدار کو بھی فراموش نہیں کرتی ہے۔ وہ روشن خیال اور بچوں کی دوست بھی ہے لیکن اپنی خواہش کا کھل کر اظہار نہیں کرپاتی کہ بچے مشرقی لوگوں میں شادیاں کریں۔

سجیلہ پاکستان سے امریکہ منتقل ہونے پر مشرقی اور مغربی دونوں سماجی اقدار کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے امریکی معاشرے میں اپنے لیے جگہ بنانا چاہتی ہے۔ انسان وقت کے تیز دھارے میں بہتے ہوئے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ فکر معاش یا بہتر سہولیات زندگی کے لیے سفر کرتا ہے۔ اس سفر میں ناجانے کتنی بستیوں اور ملکوں سے دامن بچا کر اپنے وطن سے دور اجنبی بیگانی فضا میں پناہ لیتے ہیں۔ نقل مکانی اپنی مرضی سے ہو یا جبر کے تحت ہو کردار گم گشتہ جنت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے من میں ماضی کے یاد کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں۔ سجیلہ کی جڑیں امریکہ میں رہتے ہوئے پاکستان میں پیوست ہیں۔ وہ ماضی کی یاد میں مسلسل بکھرتی چلی جاتی ہے۔ نقل مکانی ہر کردار کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ شعوری و جذباتی وابستگی اپنی جنم بھومی سے ہے اور امریکی معاشرے میں بھی متوازن قیام چاہتی ہے۔

> تاریخ انسانی میں نقل مکانی کا عمل ایک مسلسل سفر کی صورت میں اثر پذیر ہوا ہے۔ جو محض جسمانی ہی نہیں بل کہ ذہنی سفر بھی ہے یہ ہی ذہنی سفر انسان کو بیک وقت حال اور ماضی میں یکساں متحرک رکھتا ہے۔[۲۸]

سجیلہ متضاد کیفیت کا شکار کردار ہے۔ وہ معاشرے کی ڈیمانڈ کے مطابق ماڈرن بھی ہے اور بعض اوقات نسل پرست عورت کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ چاہتی ہے بیٹا کسی امریکن عورت کے چکر میں نہ پڑے بلکہ پاکستانی سے شادی کرے جسے روایات کا پاس رکھنا آتا ہو۔

سجیلہ اپنی اور بچوں کی شناخت کو خطرے میں دیکھ کر بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا بچوں کے مستقبل کے بارے میں خدشات میں گری خالق کائنات سے تعلق مضبوط کر کے پناہ چاہتی ہے۔ کسی بھی سرزمین پر مختلف تہذیبوں سے وابستہ افراد قیام پذیر ہوتے ہیں لیکن جب کسی ایک مخصوص تہذیب سے وابستہ لوگوں کو نظر انداز کیا جائے ان کو دہشت گرد اور غیر مہذیب اقوام سمجھا جاتا ہے تو شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں جب ان کی حیثیت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی متعین کردہ شناخت ان پر مسلط کر دیتے ہیں۔ سجیلہ بچوں کے مستقبل سے متعلق پریشان نظر آتی ہے۔ مصنفہ نے بڑی چابک دستی سے کردار کے احساسات وجذبات اور خیالات کا اظہار خود کلامی کے زریعے کیا ہے

> امریکہ ان کا اپنا پیارا اور لاڈلہ ملک ہے۔ وہ یہاں غیروں کی طرح نہ محسوس کرنے لگیں۔ امریکا میں پیدا ہونے والے بچے امریکا کے ہیں، وہ کہاں جاسکتے ہیں؟ بڑی مشکل ہو جائے گی۔ [۲۹]

سجیلہ جرنلزم اور امریکہ میں ادھر ادھر سفر کرنے کی وجہ سے امریکہ سے متعلق کافی معلومات رکھتی ہے۔ اس کردار کے زریعے سے مصنفہ مشرق ومغرب کے کلچر کے درمیان فرق اور دونوں معاشروں کے تضاد کو بیان کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تعصب نظر نہیں آتا لیکن دلی وابستگی اپنے کلچر سے فطری عمل ہے۔

> اپنے لوگ، اپنا کلچر ہی بہتر ہوتا ہے۔ بے شک تم لوگ یہاں پیدا ہوئے ہو مگر امریکن ماحول اور کلچر کا ہم سے بہت فرق ہے۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ سجیلہ نے بے بسی سے کیا۔ [۳۰]

سجیلہ کی یہی خواہش ہوتی ہے بچے پاکستانی کلچر کو اپنائیں نور جہاں، مہدی حسن، لتا کے گانے سنیں شادی بیاہ کی تقریبات پر پاکستانی ملبوسات زیب تن کریں شناخت کسی کردار کے رنگ ونسل، مذہب، عقائد اور دیگر کئی عناصر سے وابستہ ہوتی ہے۔ بقول محمد رانا عامر

> شناخت اکثر وبیشتر واضح طور پر رنگ، نسل یا مذہب سے تعلق رکھتی ہے تاہم کسی ایک گروہ کے اندر احساس محرومی بھی بعض اوقات ایک مجموعی شناخت کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔۔۔ شناخت دنیا کے کئی حصوں میں مروجہ سیاسی نظام کی شکست وریخت کا باعث بن رہی ہے۔ [۳۱]

سجیلہ یا بچے جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوں سجیلہ فوری تسبیح وظائف کا سہارا لیتے ہوئے خدا کے حضور سجدہ ریزی ہو جاتی ہے۔ جب مراد کی دہشت گردی کے الزام سے ضمانت ہوتی ہے وہ تب بھی فوری سجدہ ریز ہونا

چاہتی ہے تا کہ شکر بجالا سکے لیکن وہ خود کو سب کے سامنے مسلمان ظاہر کرتے ہوئے خوف محسوس کرتی ہے۔ سجیلہ کا یہ عمل نہ صرف ایک کردار کا گیارہ ستمبر کے بعد کا ردعمل ہے بلکہ تمام تارکین وطن کے خوف کی عکاسی ہے جو انھیں غیر سرزمین پر ہونے کا احساس دلاتی ہے جہاں وہ اپنی مرضی سی اپنے کسی فعل سے اپنی شناخت بطور مسلمان کرواتے ہوئے ڈرتے ہیں اور یہی ڈر انھیں بے شناخت کر دیتا ہے۔

> اپنے مسلمان ہونے کا مذید مظاہرہ نہ ہی کرے تو بہتر ہے۔۔۔ امریکا میں مسلمان کے خوف زدہ ہونے کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ [۳۲]

سجیلہ شناختی بحران کا شکار ایسا کردار ہے جو اپنی جڑوں سے عقیدت کے باوجود نائن الیون کے سانحے اور بیٹے پر دہشت گردی کے الزام کے بعد اپنا مشرقی لباس پہن کر باہر جانے سے کتراتی ہے۔ مراد کے مقدمے کی سماعت کے لیے امریکی لباس پینٹ شرٹ پہن کر جاتی ہے۔

امریکن جیسا لگنا چاہتی ہے لیکن مغربی عدالتوں پر بھروسہ نہیں کرتی۔ مراد اور سجیلہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سجیلہ کے اندر خوف، ناامیدی اور مغربی نظام پر بے اعتباری کی جھلک عیاں ہوتی ہے۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس بے چین کرتا ہے۔ سجیلہ مراد سے کہتی ہے۔

> مجھے تو امریکن عدالتی نظام پر کوئی اعتماد نہیں ہے، سچ بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ بہت نسل پرست ہیں"
> "جس کو چاہیں پھنسا دیتے ہیں"
> "بڑے متعصب ہیں یہ امریکن لوگ۔ چاہے ساری زندگی یہاں گزار لو، یہیں جنم لو، آپ سیکنڈ یا تھرڈ کلاس شہری ہی رہتے ہیں۔ [۳۳]

ہم ناول میں دیکھتے ہیں کہ تارکین وطن کو کیسے جکڑ لیا جاتا ہے وہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں سجیلہ پاکستانی فیملی کی بہو اور داماد چاہتی ہے کیوں کہ شناختی بحران کا شکار فرد دوسری تہذیبوں کے افراد سے دوری چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی تہذیب، اقدار، روایات اور طرزِ معاشرت وغیرہ ان سے مختلف ہوتی ہے۔ سجیلہ ایسا ہی شناختی بحران کا سامنا کرتے ہوئے غیر محفوظ کردار ہے جو اپنے جیسے رہن سہن اور تہذیب کے لوگوں کو تلاش کرتی ہے۔ غیر تہذیب کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کرتی کسی حد تک یہ کردار نسل پرست ہے اسی وجہ سے ڈی اور شیری دونوں کو اپنے بیٹے کی زندگی میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ سجیلہ جتنی ہی ماڈرن کیوں نہ ہو مایوس اور بے شناخت ہو کر مذہب میں پناہ تلاش کرتی ہیں۔

طاؤس فقط رنگ کا ہر کردار ترک وطنی کے بعد شناختی بحران کا شکار نظر آتا ہے۔ جائے پاکستان سے

وطن ترک کر کے امریکہ آنے والے عقل بیگ، سجیلہ یا ان کی اولادیں ہوں یا گیانا ٹریجڈی کے بعد وطن ترک کر کے نیو یارک منتقل ہونے والے کردار مسٹر چین (لیو) قمر النساء (سو)، شیری یاڈی ہو سب کردار ہر روپ میں شناخت کے مسئلے سے دوچار نظر آتا ہیں۔ کوئی بھی کردار جن بھی وجوہات کی وجہ سے اپنا ملک ترک کرے خواہ سیاسی و سماجی بنا پر ہو یا ماحول سے ناآسودگی، کوئی بھی داخلی و خارجی وجوہات ہوں اس سے ترکین وطن کے لیے دوسرے ملک و معاشرے میں شناختی مسائل جنم لیتے ہیں۔ مسٹر چین اور مسز چین گائی نیز جوڑا ہیں جو گیانا ٹریجڈی کے بعد اپنی جان بچاتے چھپتے چھپاتے نیو یارک منتقل ہو جاتے ہیں۔

مسٹر چین برٹش آرمی کہ ملازمت سے ریٹائر تھے مسز چین کا نام قمر النساء ہے جسے گیانا میں جم جونز نے سو نام دیا تھا۔ مسز چین نیو یارک کے بلومنگ ڈیل سٹور میں مینجر کی جاب اور ہسٹری کی پروفیسر بھی رہ چکی ہوتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی نرم طبیعت کے مالک اور مہربان ہیں۔ ان کے گھر گائی نیز فیملیوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کچھ سانولے کچھ چاہنیز نقوش کے مالک لیکن ان کے نام عجیب مکسچر ہوتے ہیں جیسے کہ رابرٹ حسین سنگھ، بی بی رمیش فاطمہ وغیرہ۔ انگریزی زبان بولتے ہیں لیکن ان کا لہجہ امریکیوں سے بہت مختلف ہے۔ کھانے دیسی انداز میں کھاتے ہیں۔ مسز چین گائی نیز میوزک سنتی ہیں جو عام طور پر انڈین گانوں کی دھن پر سیٹ کیے گئے ہوتے ہیں۔ مسٹر چین اور مسز چین ماضی کی یادوں کو ہمیشہ سینے میں بسائے رکھتے ہیں۔

یہ دونوں ناسٹلجیا کا شکار کردار گیانا کی یاد میں اکثر ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیلی فوربیا سے جم جونز نامی ایک شخص جو کہ ایک پادری تھا اپنے ہم خیال لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے اپنے نظریات کس پرچار کرتا ہے گیانا میں کمیونٹی بساتا ہے۔ گیانا میں ہی یہ دونوں کردار بستے تھے جنھیں جم جونز نے ان کی اصل شناخت کو رد کرتے ہوئے اپنی مرضی کی شناخت اور نام جو کہ سو اور لیو ہیں۔ کمیون میں سب لوگوں کو جم جونز کے دیئے گئے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کسی بھی فرد کا نام اور اس کے والدین کا نام اس کی پہچان ہوتی ہے۔ گیانا کے کمیون پر جن جونز کے قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ گیانا سے کوئی بھی فرد اپنی مرضی سے گیانا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ انھیں سخت نگرانی میں رکھا جاتا تاکہ بھاگنے نہ پائیں۔ جن جونز یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ جم کے قوانین پر عمل نہیں کرتا چاہتے لیکن خود کو بے بس پاتے ہیں نہ وہاں سے بھاگ سکتے ہیں نہ ہی وہاں رہنا آسان ہے کیوں کہ ان کی کوئی شناخت کوئی حیثیت نہیں ایک بے بس غلام کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

گیانا کے اس کیمون میں لوگوں کو کڑی نگرانی میں رکھا جاتا۔ چاروں طرف خاردار تاریں اور مستقل گارڈ حفاظت کے لیے تیار رہتے۔۔خود (جم جونز) وہ جسے چاہتا اپنی خواب گاہ میں طلب کر لیتا اور کہتا میں 'تمہارا خدا ہوں'۔۔۔ ہر ایک کو اپنی مرضی پر چلاتا ہے۔ [۳۴]

کرداروں سے ان کے مذہبی عقائد و نظریات، رسم ورواج، روایات و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی چھین لی جاتی ہے۔ خاص طور پر مسلمان کرداروں کی شناخت شدید متاثر ہوتی ہے۔ مصنفہ نے ناول میں گیانا المیے کے متاثرہ میں سے دو اہم کردار مسٹر چین اور مسز چین کو درپیش صورت حال کو بیان کرتی ہیں۔ مسٹر چین جنھیں جم جونز کی طرف سے سو کا نام دیا جاتا ہے۔ اور مسز چین کو جم جونز کی طرف سے لیو نام دیا جاتا ہے۔ جم جونز سب کو نئے نام اور نئی شناخت دیتا ہے اور ان سے ان کے اصل نام اور شناخت چھین لیتا ہے۔ ان کی حیثیت محض غلام کی سی ہے جن پر ہر وقت ایک آقا جم جونز کی صورت میں مسلط رہتا ہے۔ خوف اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے لیکن مسز چین بعض اوقات ایک مضبوط عورت کے روپ میں ڈٹ جاتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی جم جونز کے ظلم و ستم سہنے کے بجائے بغاوت پر اکساتی ہے۔ مسٹر چین مسز کی نسبت ایک کمزور کردار کے طور پر نظر آتا ہے جو جم جونز کے خوف سے ناچاہتے ہوئے بھی سب کچھ کرتا ہے لیکن بغاوت نہیں کر پاتا۔

مسز چین ایک مسلمان عورت ہے اپنے مذہبی عقائد کے باعث وہ جم کے قوانین پر عمل نہیں کرنا چاہتی وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے فرد سے جسمانی تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتی اس کا مذہب اسے اس عمل کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ ہی وہ خود اپنے محبوب شوہر سے بے وفائی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتا یہ کرب کہ ناچاہتے ہوئے بھی اپنا وجود جم جونز کو سونپنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو گیانا سے بھاگ کر دور کسی جگہ جانے کی ترغیت دیتی ہے۔ جب افراد سے ان آزادی چھین لی جاتی ہے ان کے حقوق کا یوں استحصال ہوتا ہے وہ داخلی گھٹن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا اپنی شناخت کے حوالے تلاش کرتے ہیں۔

سب کو زبردستی جنسی تعلقات پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انکار کی صورت میں موت سامنے نظر آتی ہے جس کے خوف سے کیمون جائز ناجائز ہر فعل سرانجام دیتے ہیں۔ سو (مسز چین) اور لیو (مسٹر چین) ایک دوسرے کے علاوہ کسی کے ساتھ جسمانی تعلق قائم نہیں کرتا چاہتے۔ لیکن جن کو یہ اطلاح ملتی ہے کہ اس کی حکم عدولی کی جارہی ہے وہ فوری دونوں کو حاضر کرواتا ہے اور حکم دیتا ہے۔

جاؤ اور لیو کو سلویا کے بیڈ روم میں چھوڑ آؤ لیو اور سو نے تابعداری سے سر جھکالیا۔ [۳۵]

لیو کو سلویا کے کمرے میں چھوڑ کر جم کونز خود سو کو طلب کرتا ہے۔ جم جونز کا کیمون پر ظلم و زیادتی اور ان

کے حقوق کا استحصال انھیں زندگی کی محرومیوں اور شناختی بحران کی طرف دھکیل دیتا ہے۔وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز نہیں اٹھاسکتے ہیں۔بغاوت کا انجام موت ہے اسی لیے دونوں میاں بیوی اپنے حقوق کے استحصال ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے آواز نہیں اٹھاپاتے۔شناخت کا مسئلہ عموماتب بھی جنم لیتا ہے جب کسی کے ساتھ ناانصافی ہو اس کے حقوق کا استحصال ہو فرد کی ذاتی خود مختاری متاثر ہوتی ہے اکثر طاقت ور دوسرے کمزور طبقے سے اس کی شناخت چھین لیتا ہے۔جم جونز طاقت کے نشے میں سرشار خود کو سولیو اور تمام کیمون کا خدا سمجھتا ہے اور کیمون کی حیثیت ایک غلام جنتی ہے جو کہ حکم کے پابند ہیں۔سو جنسی استحصال کے بعد اپنے آپ سے گھن محسوس کرتے ہوئے آنسو بہاتی ہے اور کہتی ہے۔

> میں یہاں رہتے رہتے اکتا گئی ہوں، جم جونز خود کو کبھی عیسی، کبھی گاندھی، کبھی بدھا کہتا ہے مگر میں درحقیقت اسے صرف انسان سمجھتی ہوں۔مجھے اب یہاں نہیں رہنا چلو بھاگ چلتے ہیں سو کیا بات کر تی ہو۔۔۔جو بھی کیمون سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے،اسے گولی مار دی جاتی ہے اس لیے چپ رہو ۔۔دونوں ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔[۳۶]

جونز کے سخت قوانین اور بے جا سختی سے سو اور لیو کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی خود کو مقید اور محصور سمجھنے لگتے ہیں خفیہ امریکی کانگریس کو خط لکھ کر مدد چاہتے ہیں۔گیانا سے بھاگنے پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔محرومیوں اور زندگی کی تلخیوں سے لاچار جلاوطنی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔گیانا سے ہجرت بھی سو اور لیو کو ایک بار پھر سے شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔جم جونز پہلے بے شناخت کرتا ہے پھر گیانا سے ہجرت انھیں نئی شناخت عطا کرتی ہے مسٹر چین اور مسز چین (قمر النساء) کے ناموں سے نیو یارک میں جانے جاتے ہیں۔یہ دونوں کردار ماضی کی یاد میں تڑپتے ہیں گیانا سے دور جا کر بھی اس دکھ انگیز سحر سے نجات نہیں پاتے۔ملے جلے نام اور شناخت یہ کردار دوہری شناخت اپناتے ہیں۔عصری اور انفرادی شناختی بحران کے ہاتھوں ان کی ابدی اور دائمی شناخت چھین جاتی ہے۔دونوں کو یادِ ماضی ڈپریشن میں مبتلا کرتی ہے۔مسٹر چین گیانا سے لائی صندوق کھولتے ہیں یاروں کے تازہ ہوتے ہی گزرے وقت کی اذیت نظروں کے سامنے آتی ہے مسٹر چین کی ماضی پرستی کی عکاسی ان کے ان جملوں سے ہوتی ہے۔

> کرنا کیا ہے؟ انھیں میرے ساتھ دفن کر دینا۔میں تو بس ایک بار دیکھنا چاہتا تھا نہ جانے ۔۔۔میرا ماضی۔۔۔۔۔[۳۷]

مسٹر چین جغرافیائی سطح پر اپنی خطے سے دوری ناسٹلجیا جسمانی طور پر جلا وطنی انھیں بے شناخت اور اداس کرتی ہے وہ ذہنی طور پر گیانا کے جزیروں میں ہی بے شناخت بھٹکتے ہیں۔مسٹر چین عیسائی جبکہ مسز چین قمر

النساء مسلمان ہیں دونوں اپنے اپنے مذاہب پر قائم زندگی گزارتے ہیں۔ مسز چین کے آباؤ اجداد ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوتے ہیں پے در پے ہجرت بھی ان کو اصل سے دور ملی جلی شناختوں کو اپنانے پر مجبور کرتی ہے جہاں وہ اپنی اصل شناخت تہذیب، طرزِ معاشرے سے دور ملی جلی تہذیبوں کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔ آباؤ اجداد سے ترک وطنی آگلی نسلوں کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اپنی جڑوں سے کٹ کر اپنی تہذیب و تمدن خاندان کو چھوڑ کر مختلف رنگ و نسل کے لوگوں سے میل ملاپ ان کو ان کے اصل سے دور کر دیتا ہے۔ مسز چین بھی شوہر کی طرح بے چین، بے سکونی و اضطرابی کیفیت میں مبتلا دوہری شناخت کی اذیت سے دوچار ہوتی ہیں۔ مسز چین گیانا کی یادوں میں کھو کر ذہنی و جسمانی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہی ذہنی انتشار اور بے یقینی اور اضطراب کی کیفیت ان کی اپنی ذات کے بارے میں سوالات اٹھاتی ہے۔

> میرا آغاز کہاں سے ہوا اور اب انت کہاں ہو گا۔ کتنا سفر طے کر آئی ہوں۔ انسان کبھی ایک جگہ ٹھہرا کیوں نہیں۔۔۔ ہچکولے چین سے جینے ہی نہیں دیتے۔[۳۸]

سفر زندگی کی بقاء کی علامت ہے۔ ڈی مسز چین اور جم جونز کی بیٹی ہے جس حقیقت سے وہ ساری زندگی چشم پوشی کرتی ہیں۔ آخر وقت ڈی کو آئینے کی مانند اس کے ماضی سے روشناس کرواتا ہے۔ شناخت اور عدم شناخت کے دائرے میں تیرتی مسز چین اور ڈی دونوں ماں بیٹی جبر کا سامنا کرتی ہیں۔ اور ڈی بے شناختی کی دیواروں کو پھلانگتی ہوئی حقیقت کو پالیتی۔ مسز چین ترک وطنی کے جبر میں پستی بے شناختی کا سامنا کرتی ہیں۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کے بچپن کی حسین یادوں ہوتی ہیں انھیں بھولنا مشکل امر ہے وہ فرد کی شناخت کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ وہ شناخت کی پہلی منزل کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں لیکن ذہنی طور پر خود بھی گیانا کے جزیروں بھی رہتی ہیں۔ ماضی کی بازگشت بعض اوقات حال پر حاوی آجاتی ہے۔ مٹی سے محبت فطری جذبہ ہے لیکن ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شناخت کا مسئلہ ہے۔

اسفند مراد کا دوست دونوں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ساتھ ملازمت کرتے تھے۔ اسفند کا تعلق پاکستان سے ہے وہ پٹھان تھا۔ فکر معاش اور بہتر سہولیات زندگی کی خواہش اسے اپنا وطن ترک کر کے اپنے عزیز و اقارب سے بچھڑ کر امریکہ میں اپنا بہتر مستقبل بنانے کے لیے لے آتی ہے۔ ترک وطنی عارضی طور پر ہو یا مستقبل دونوں صورتوں میں ہی اذیت سے تارکین وطن کو گزرنا پڑتا ہے۔ جب تارکین وطن دوسرے ملک میں خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہیں تو وہ شناختی، نفسیاتی، تہذیبی و ثقافتی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسفند اپنا ملک ترک کر کے امریکہ میں آجاتا ہے لیکن سجیلہ کی طرح اپنے وطن کو یاد کرتا ہے۔ ناسٹلجیا کا شکار ماضی کی یادوں میں جینے والوں کے لیے حال میں

امریکی معاشرے کے ساتھ قدم قدم چلنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسفند اپنے ماحول سے نکل کر امریکی معاشرے کی اجنبی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ وہ نہ ہی مغربی تہذیب و ثقافت، رہن سہن کو اپنا سکتا ہے نہ ہی اپنے تہذیب، رہن سہن کو فراموش کر سکتا ہے۔ تبدیلی وطن کے تجربات اس کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا وہاں قیام پذیز ہونا فرد کے اندر اپنی زمین سے دوری کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ بہت سارے روایات و قدار سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے جس سے تارکین وطن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شناختی بحران کا جنم لینا ہے۔ اسفند امریکہ میں اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ یادوں کو سینے میں بسائے رکھتا ہے۔ اسفند مراد سے اپنے وطن کی یاد میں تڑپا دینے والی کیفیات کا اظہار کرتا ہے تو مراد اسے ناسٹلجیا کا شکار کہتا ہے۔ اسفند امریکہ لڑکیوں اور کلچر سے رغبت نہیں رکھتا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے وقت ڈی اسفند سے محبت کا اظہار کرتی ہے انکار کی صورت میں اسے جلتی ہوئی لفٹ میں دھکیل دیتی ہے جس کے دھویں میں غائب ہوتا اسفند غیر زمین پر بے شناخت بے نام ونشان مٹ جاتا ہے۔

کنول پاکستانی تارکین وطن کے جوڑے سجیلہ اور عاقل بیگ کی بیٹی اور ناول کے مرکزی کردار مراد کی بہن ہے۔ کنول نیوجرسی یونی ورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی طالبہ ہے۔ والدین کی علحیدگی سے بچے جدائیوں اور ملاپ کے مدار میں تیرتے ہیں۔ کنول، سجیلہ، مراد، عاقل بیگ ایک گھر کے افراد ہوتے ہوئے اپنے اپنے مداروں میں گھومتے ہیں۔ کنول امریکہ میں پیدا ہوئی اسی ماحول میں پرورش پائی اسی تہذیب کو اپناتی ہے۔ اپنے آباؤاجداد کی تہذیب و ثقافت سے واقفیت نہیں رکھتی۔ تہذیب و ثقافت، رنگ و نسل، مذاہب، جغرافیہ، زبان،، لباس، رہن سہن ایسے عناصر ہیں جو مختلف تہذیبوں کے فرق کو نمایاں کر کے شناخت عطا کرتے ہیں۔ کنول اصل سے کٹ کر مغربی معاشرے کو اپناتی، امریکن لباس پہنتی، پارٹیوں میں شرکت، ڈانس گانا سب سے محضوظ ہوتی ہے۔ مذہب سے بھی زیادہ لگاؤ نہیں رکھتی وہ تعلم یافتہ شہری ہے۔ لیکن گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد سب کا وہی حال ہوتا ہے جو مسلمان تارکین وطن اور ان کی اولادوں کا ہو رہا ہے۔ وہ بچے جنھوں نے امریکہ سرزمین پر آنکھ کھولی ان کے لیے بھی وہ زمین پرانی اور شناخت مسخ ہو جاتی ہے۔ تارکین وطن اور ان کی آگلی نسلوں کے لیے دیگر کئی مسائل کے ساتھ شناخت کا مسئلہ بھی سر اٹھاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کا سانحہ ایسا تھا جس کے بعد مسلمان تارکین کی بسی بسائی زندگی کی بساط الٹ جاتی ہے۔

> نائن الیون نے ساری دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ انتقام، حملے، نفرتیں، تعصبات، اختلافات، الزام تراشیاں، بندشیں، ایک عجب سے نامہرباں دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ [۳۹]

کنول اور مراد کے درمیان ہونے والی گفتگو کرداروں کو درپیش شناختی بحران کی باخوبی عکاسی ہوتی ہے۔

> بھائی آپ کو شاید ابھی تک یہ یقین نہیں آرہا کہ اب ہم جیسے امریکن بارن بھی سیکنڈ کلاس سیٹزن بن چکے ہیں ہمیں اپنے ہی ملک میں یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔ ہم بے بس ہیں۔ [۴۰]

بے وطنی کا احساس خوشیوں کو چاٹ لیتا ہے۔ اپنے ہی ملک میں اجنبیت کی فضا اور اپنے ہی گھر میں جلاوطنی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ کنول مراد کی طرح امریکن لڑکی جسے آزادی اور خود مختار طریقے سے زندگی گزارنا سکھایا جاتا ہے۔ اپنی مرضی سے پاکستانی لڑکے کو شریک حیات منتخب کرتی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد یہ حقیقیت عیاں ہوتی ہے کہ امریکہ ان کی جائے پیدائش اب ان کی حیثیت اس سرزمین پر غیر کی سی ہے۔ کنول کی طرزِ حیات شدید متاثر ہوتے ہوئے تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتی ہے ۔نہ وہ مکمل مشرقی نہ مکمل مغربی طرزِ حیات کو اپناتی ہے۔ کنول آدھی امریکن آدھی دیسی معلوم ہوتی ہے۔ مغربی طرز کے مطابق شریکِ حیات اپنی مرضی سے منتخب کرتی ہے لیکن شادی مشرقی تہذیب اور طرز کے مطابق کرنا چاہتی ہے۔ مشرقی لباس اور مہندی وغیرہ پسند کرتی ہے۔

> مجھے اپنا پاکستانی ہیری ٹیج بہت پسند ہے۔ اتنی کلرفل اور اتنی ورائٹی ہے اس میں بڑا مزہ آتا ہے پاکستانی بن کر۔ [۴۱]

دونوں بچوں کے خیالات کتنے مختلف ہیں۔ ایک مکمل امریکن اور ایک آدھی دیسی ادھی امریکن ٹھکرائے جانے کا احساس اور بے توقیر ہونا اسے غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔ نماز کی پابندی اور ساتھ ہی پردے کا اہتمام کرتی ہے جسے دیکھ کر ماں خوف ذدہ ہو جاتی ہے کئی پردہ اور مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم کے ساتھ نہ جوڑ لیا جائے۔ مصنفہ مختصر جامع اندار میں کرداروں کی گفتگو اور ان کے خیالات سے ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس اپنی شناخت مشکوک ہونے کے بعد کے نتائج کا ڈر انھیں بے چین کرتا ہے۔ سجیلہ دونوں بچوں کے بارے میں کہتی ہے۔

> سر پر حجاب اور کپڑوں پر عبایا دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے۔ بیٹے پر پہلے ہی مسلم ٹررسٹ ہونے کا الزام لگ رہا ہے۔ اب بیٹی بھی بنیاد پرست حلیے میں آگئی ہے۔ کہیں پولیس اور ایف بی آئی ان دونوں باتوں کی آپس میں کڑیاں ملانے نہ بیٹھ جائیں۔ [۴۲]

کنول زندگی کے نشیب و فراز کے ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتے ہوئے مذہب میں پناہ تلاش کرتی ہے۔ شمع اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان سے امریکہ منتقل ہوتی ہے۔ مراد سے شادی کے بعد جلد ہی ناکامی ہو گئی۔ شمع بھی مراد کی طرح رشتوں میں توازن قائم نہیں کرپاتی۔ غیر متوازن شخصیت کی حامل شمع مکمل طوپر امریکی طرزِ حیات

میں کو اپناتے ہوئے اپنے مشرقی کلچر کو فراموش کر دیتی ہے جن کہ اس کی پیدائش پاکستان کے شہر کراچی میں ہوتی ہے زندگی کے ابتدائی ایام وہی بسر کرتی ہے۔ شمع پاکستانی نیویارکر لڑکی خود کو مکمل طور پر امریکی ثابت کرنے کی دوڑ میں دوسرے تارکین کے ساتھ شامل ہوتی ہے جو دوسروں کی تقلید میں اپنے اسلامی آداب معاشرت کو فراموش کر دیتی ہے۔ سگریٹ پیتی اور ، مادہ پرستی کی بنیاد پر شوہر پر اپنی ملازمت کو ترجیح دیتی ہے۔ اپنے لباس زبان اوراقدار کو فراموش کر کے مختصر مغربی لباس اور زبان اپناتی ہے۔ امریکن کی اندھی تقلید اور ان جیسا بننے کی لگن میں اپنی شناخت کھو کر فریب بھری زندگی گزارتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں گھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار اپنی تہذیب اور شناخت گم ہونے ، دوسروں کی تقلید کے باعث بکھرتے وجود اور ٹوٹتے رشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ شمع مشرق سے گئی ہوئی لڑکی مغربی معاشرے کی فضا میں زندگی کا توازن قائم نہ رکھتے ہوئے باغی ہو کر درست سمت کا تعین نہیں کر پاتی۔ وہ سمجھ نہیں پاتی ماں باپ کے ساتھ رہے یا شوہر کے ساتھ رہے وہ بے سمتی کا شکار کردار ہے۔ شمع اپنے حالات سے مکمل باغی خود کو امریکی طرز میں ڈھالنے کے لیے انداز چال ڈھال سے کوئی قیاس نہیں کر سکتا کی پاکستان سے آئی لڑکی ہے۔ یہ کردار دو تہذیبوں کے امتزاج کی پیداوار دوہری شناخت کی حامل ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے کرداروں کی نفسیاتی معاملات میں الجھا کر قاری کی نفسیات کو متاثر کرتی ہیں۔ منیر احمد فردوس طاؤس فقط رنگ کی کردار نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کردار نگاری کے حوالے سے طاؤس فقط رنگ یکسر طور پر نئے نفسیاتی معاملات کو ڈسکس کرتا ہوا قاری کی نفسیات پر ایسا بھرپور وار کرتا ہے کہ ناول کے سبھی کردار متحرک ہو کر اپنی مکمل شباہتوں کے ساتھ قاری کو گھیر لیتے ہیں اور خاص طور پر مراد، شیری اور ڈی کے کردار اپنی جبلی خصلتوں کے اعتبار سے نئی نفسیات گری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ [۴۳]

کنول کی دوست ہے جس کا تعلق پاکستان کے مشہور شہر لاہور سے ہے مگر وہ ترک وطنی کے بعد امریکہ منتقل ہو جاتی ہے اور نیو یارک کے کالج میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ یہ کردار اپنے حالات وواقعات سے مکمل باغی ہے جو اپنی تہذیب و ثقافت ، اپنی روایات واقدار ، رہن سہن ، لباس سب چھوڑ دیتی ہے جو اس کی پہچان ہے اور امریکی کلچر کو اپنا لیتی ہے کسی بھی فرد کو اس کا معاشرہ ، رہن سہن لباس ، طرزِ معاشرت ، لباس ، زبان و بیان اسے شناخت عطا کرتی ہے۔ تہذیب و ثقافت افراد کی شناخت کا سرچشمہ ہے۔ ہر معاشرے کے اپنے اقدار ہوتے ہیں جو اسے دوسری تہذیبوں سے منفرد شناخت اور الگ شناخت عطا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کردار ماضی کو پس پشت ڈال کر اپنی جڑوں سے کٹ کر اغیار کی شناخت کو اپنانے کی کوشش اور اپنی اس ماحول میں جگہ بنانے کے لیے اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔

مختصر طور پر دیکھیں تو کردار نگاری جان دار ہے کرداروں کی زبان و بیان کرداروں کے معیار کے مطابق ہے۔ ہر کردار شناختی بحران کا شکار اور غیر محفوظ نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے ناول کے مردانہ کرداروں کے بجائے نسائی کردار زیادہ مضبوط اور مستحکم ہیں۔ تمام کردار اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول کے کردار فنی و فکری لحاظ سے دونوں سطحوں پر ہمہ جہت پورے اترتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار مراد غیر مستقل مزاج ہے جس کی شخصیت بکھری ہوئے ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ وہ اکیلے نہیں رہ سکتا ہر وقت دوسروں کے سہاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ مراد پر دہشت گردی کے الزام کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کردار نسائی کرداروں کی نسبت کمزور کردار ہے وہ مسلمان تارکین وطن اور ان کی اولادوں کی بے بسی اور بے شناختی کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسے ہی نسائی کرداروں میں پورے ناول پر چھایا ہوا کردار ڈی کا ہے جو مضبوط بے خوف و خطر ہر صورت حال کا سامنا کرنے والی جادوئی طاقت کی حامل ہے لیکن یہ کردار بھی شناختی بحران میں مبتلا ہے لیکن اس کی نوعیت دوسرے کرداروں سے مختلف ہے۔ سجیلہ اور مسٹر چینن اور مسز چینن ناسٹلجیا کا شکار کردار ہیں۔ شیری اور کنول کا کردار بھی ناول میں اہم ہے وہ باہمت لڑکیوں کے روپ میں نظر آتی ہیں، کنول جب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے تو مذہب میں پناہ تلاش کرتی ہے۔

طاؤس فقط رنگ امریکی پس منظر میں گیارہ ستمبر کے سانحے کے باعث تارکین کرداروں کی بے شناختی کا نوحہ ہے۔ ناول میں گیارہ ستمبر کے نتیجے میں فکری، سماجی و سیاسی، تہذیبی و ثقافتی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے مسلمان تارکین کی زندگیاں شدید متاثر ہوئیں۔ طاؤس فقط رنگ کا ہر کردار ترک وطنی کے بعد شناختی بحران کا شکار نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کی زبان و بیان کو ان کے ماحول اور حالات و واقعات کے مطابق استعمال کیا ہے۔ ہر کردار وقت کے تیز دھارے میں بہتے ہوئے اپنی شناخت کی تلاش کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ناول میں گیانا ایسے کا ذمہ دار جم جونز کے نام کی غلطی موجود ہے جسے ٹم جونز لکھا گیا ہے۔

ناول میں کرداروں کا ہجوم نہیں ہے لیکن جو کردار موجود ہیں وہ اپنی فطری ذہنیت کے حامل ہیں۔ ناول میں کرداروں کے نام تو فرضی ہیں لیکن یہ سب کردار حقیقی معاشرے کے ترجمان ہیں۔ جو اپنے معاشرے کی صورت حال اور درپیش مصائب کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض اوقات کردار جبر اور بے شناختی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے حوصلہ ہارتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات امید کی رسی یقین کے ساتھ تھام لیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صفیہ عباد،رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ(اسلام آباد:پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)،ص ۹۱۔

۲۔ https://www.humsub.com.pk

۳۔ ایضاً،ص ۱۸۔

۴۔ https://www.humsub.com.pk

۵۔ ایضاً،ص ۲۰۔۳۰۔

۶۔ ایضاً،ص ۴۰۔

۷۔ ایضاً،ص ۴۳۔

۸۔ ایضاً،ص ۴۷۔

۹۔ ایضاً،ص ۵۱۔۵۲۔

۱۰۔ ایضاً،ص ۳۲۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۵۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔۱۴۱۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۱۹۹۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۲۰۵۔

۱۵۔ ایضاً،ص ۲۱۳۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۲۱۹۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۲۳۹۔

۱۸۔ مسز ثناءرشید،ماہنامہ العمر (مارچ ۲۰۱۸ء)،ص ۲۱۔

۱۹۔ https: \\www.humsub. com .pk

۲۰۔ ایضاً،ص ۱۱۹۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۲۵۳۔

۲۲۔ https: \\ www.humsub. com .pk
۲۳۔ ایضاً، ص ۶۲۔
۲۴۔ مسز ثناء رشید، ماہنامہ العمر (مارچ ۲۰۱۸ء)، ص ۲۰۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۔
۲۸۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار (اسلام اباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۰۔
۲۹۔ ایضاً، ص ۴۴۔
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔
۳۱۔ محمد رانا عامر، تجزیات، شمارہ ۸۹، (اسلام آباد: جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء)، ص ۲۳۔
۳۲۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۲۲۱۔
۳۴۔ ایضاً، ص ۸۹۔
۳۵۔ ایضاً، ص ۹۰۔
۳۶۔ ایضاً، ص ۹۱۔
۳۷۔ ایضاً، ص ۵۸۔
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۲۹۔
۳۹۔ ایضاً، ص ۴۴۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۵۲۔
۴۱۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔
۴۲۔ ایضاً، ص ۲۱۹۔
۴۳۔ www.facebook.com

باب چہارم

طاؤس فقط رنگ کا موضوعی و فکری جائزہ

باب چہارم:

ناول طاؤس فقط رنگ کا فکری و موضوعی جائزہ

تخلیق کار معاشرے کا ایک احساس فرد ہوتا ہے جو اپنے معاشرے میں بکھرے المیوں اور مسرت آمیز لمحات کو اپنے اندر جذب کر کے ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخلیق، ادیب اور معاشرے کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے ادیب کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کی فکر تک رسائی کے لیے ادیب کے معاشرے اور ادیب کے بارے میں جانا بھی ضروری امر ہے۔ اس لیے مختصر طور پر پہلے مصنفہ کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ نیلم احمد بشیر بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، خاکہ نویس، اور سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق ادبی گھرانے سے ہے۔ مصنفہ کی زندگی کے کئی برس امریکہ کی سرزمین پر بسر ہوئے۔ ذاتی زندگی کے مسائل گرد و پیش میں اجنبیت کی فضا، اکیلے پن نے انھیں زندگی کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ مصنفہ نہ صرف پاکستانی بلکہ امریکی، معاشرے کے حالات و واقعات، طرز معاشرت، سیاسی و سماجی صورت حال، مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم، سماجی رویوں کو سمجھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے تحت مشاہدات کو قلمبند کیا ہے۔

امریکی سرزمین پر گیارہ ستمبر کے سانحہ کی چشم دید گواہ ہیں۔ یہ سانحہ دیکھا اس کے ردِ عمل کی صورت حال کو محسوس کیا اور حقیقت اور تخیل کی آمیزش سے ناول تخلیق کیا جس میں تارکین وطن کی بے شناختی کا نوحہ بیان کرتی ہے۔۔ ناول کے کردار سجیلہ کے روپ میں مصنفہ کی اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ ادیب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے وہ جس معاشرے میں جنم لیتا ہے یا جہاں زندگی بسر کرتا ہے اپنے تجربات و مشاہدات سے مستفید ہوتا ہے وہ اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات سے کنارہ کشی اختیار کر کے کوئی فن پارہ تخلیق نہیں کرتا۔ وہ معاشرے کا عکس اپنے فن پارے میں تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق کار اپنے عہد کے نشیب و فراز سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی جھلک فن پارے پر پڑتی ہے۔ تخلیق کار جس طرح دیکھتا ہے اور جیسا دیکھنا چاہتا ہے حقیقت اور تخیل کی آمیزش، خواب و خیال اور حقیقت کی رنگارنگی کو قلم بند کرتی ہیں جو گزرے عہد اور موجودہ عہد کی روداد ہے جہاں تارکین اپنی جڑوں سے ناطہ توڑ کر نئے ملک میں اپنے لیے جگہ بناتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کی بازی گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے بعد پلٹ جاتی ہے اور تارکین کی اسی بے سروسامانی کو مصنفہ موضوع بناتی ہیں۔

معاشرے اور تخلیق کار کا گہرا تعلق ہے وہ زندگی کی گہما گہمی میں ارد گرد بکھرے فرد کی انفرادی و اجتماعی

مسائل بیان کرتی ہیں۔

طاؤس فقط رنگ نیلم احمد بشیر کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۱۷ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا جو کہ ۲۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے ناول کا عنوان علامہ اقبال کے شعر سے منتخب کیا ہے۔

کہ بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ[1]

طاؤس فقط رنگ مشرق و مغرب کی تہذیبی و ثقافتی روایات و اقتدار کے تصادم اور اس کے باعث کرداروں کی شناختی بحران کا نوحہ اور معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال کا اس میں عکس جھلکتا ہے۔ یہ وہ ناول ہے جس کا عنوان شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے خوبصورت ناول سے ہوتا ہے۔

> طاؤس فقط رنگ نیلم احمد بشیر کا خوب صورت بیانیہ ناول ہے جس کا عنوان اقبال کے معروف مصرع بلبل فقط آواز ہےطاؤس فقط رنگ پر رکھا گیا ہے۔ ناول کا عنوان ہی کسی مور کے پر کی طرح ہمارے وجدان میں سہ رنگی سوال کے خیالات ابھرتے ہیں۔[2]

طاؤس فقط رنگ میں تارکین وطن کے شناختی بحران کا نوحہ ہے۔ ہر سرزمین اپنی تہذیب و ثقافت، طرزِ معاشرت، روایات و اقدار اور شناخت رکھتی ہے جس میں بدلتے ہوئے وقت کے پیش نظر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ افراد کی زندگی میں کئی موڑ آتے ہیں کہ وہ شناخت کے مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ جغرافیائی حدود و قیود کی پاسداری ہو یا رنگ و نسل کا امتیاز قوموں کے اندر انتشار کو فروغ دیتا ہے۔ انسان کی شناخت کا تعلق اس کے موجودہ دور اور اس کے ماضی کے ساتھ بھی وابستہ ہوتا ہے۔ انسان کی شناخت اس کے بقاء کی ضامن ہوتی ہے۔ ہر معاشرے کی اپنی تاریخ، تہذیب و ثقافت، نظریات و عقائد طرزِ حیات و اقدار ہیں جو کسی قوم یا فرد کو معاشرے میں شناخت عطا کرتے ہیں جس کا اظہار مصنفہ ناول میں کرتی ہیں۔ مصنفہ ناول میں گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ میں بدلتی ہوئی صورت حال کے تناظر میں تارکین وطن اور ان کی پیدائشی امریکن اولادوں کی بے شناختی، ہجرت زدہ لوگ فکر معاش اور بہتر سہولیات زندگی کے حصول کے لیے آئے تارکین وطن بے شناختی کی دلدل میں دھنستے ہوئے کرداروں کو موضوع بناتی ہیں۔

> طاؤس فقط رنگ خلا میں معلق رہ جاتے والوں کے خوف سے ہانپتے کانپتے عہد کی کہانی ہے۔ شناخت کے بحران کا نوحہ ہے۔ پیدائشی امریکی، ہجرت زدہ، غیر ملکی، جلا وطن، بے وطن، بے شجر، بے نصیب ایسے تمام جڑوں سے اکھڑے اوندھے منہ گرے۔۔۔ کی کہانی ہے۔[3]

مصنفہ نے اس ناول میں امریکی سرزمین پر دو بڑے المیوں اور ان کے باعث کرداروں میں جنم لینے والے شناختی بحران کو بیان کیا ہے۔ تارکین وطن بالخصوص مسلمان تارکین وطن کے لیے امریکی سرزمین کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ناول کے آغاز میں جس المیے کو مصنفہ موضوع بناتی ہیں وہ گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کا سانحہ ہے جو امریکہ میں دنیا کی بلند و بالا عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر جہازوں کے زریعے حملہ ہوا دونوں عمارتوں میں چاروں طرف آگ کے بھڑکتے شعلے ،دھماکوں کی پر زور آوازوں کے خوف سے چیخ و پکار کرتے ہوئے جلتے جسموں کی بو محسوس کرتے ہوئے گیارہ ستمبر کی دہشت گردی اور بعد کی صورتحال کو دیکھتے اس تباہ کاری کو ناول کا حصہ بناتی ہیں۔

> چاروں طرف آگ کے شعلے ،دھماکوں کی آوازیں ،دھوئیں کے سیاہ بادل انسانوں کی چیخ و پکار اور جلتے ہوئے جسموں کی چربی کی بساند تھی۔۔ایک بہت بڑا ہوائی جہاز آسمان میں اڑتا ہوا ان کی بلڈنگ میں گھس آیا اور یہ سب تباہی اسی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔[۴]

ناول کا آغاز یوں تو گیارہ ستمبر کی دہشت گردی سے ہوتا ہے اور اس کے پس منظر میں فلیش بیک کی صورت میں گیانا ٹریجڈی کو موضوع بناتی ہیں جو اس عہد کا نائن الیون ہے۔ جس کا ذمہ دار امریکی مذہبی جنونی جم جونز کے سماجی تخریبی شعور بیان کرتی ہیں۔ورلڈ ٹریڈ کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار امریکی میڈیا کے مطابق اسامہ بن لادن جبکہ گیانا المیے میں امریکی مذہبی جنونی جم جونز کیلی فورنیا سے تعلق رکھنے والا شخص کیپٹل ازم سیاست ،نسلی تعصبات و منافرت جیسے امریکیوں کے نظریات کو غلط کہہ کر اپنے ہم خیال لوگوں کے ہمرا گیانا کے کیمون میں لوگوں کو اپنی زیر نگرانی بساتا ہے۔ مصنفہ گیانا کے المیے کو یوں بیان کرتی ہیں۔

> گیانا ٹریجڈی ۱۹۷۸ء کا نائن الیون تھی۔گیانا کی تاریخ کے سینے پر ایک گہرا سرخ گھاؤ اور سیاہ بد نماہ داغ۔اس دن کے بعد جم جونز امریکا کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہ جانے والے شیطان اور بد آدمی کے طور پر جانا گیا ہے اس کے مقلد لوگ اس کی شخصیت کے سحر کے آگے بے بس ہو کر زندگی کی بازی ہار گئے۔۔وہ معصومیت میں مارے گئے۔اپنے لیے فیصلے نہ کرنے کی قوت نے انھیں زندگی سے محروم کر دیا اور گیانا امرکین لوگوں کی یادداشت میں ایک قتل گاہ کی حیثیت میں ہمیشہ زندہ رہا۔[۵]

گیارہ ستمبر کی دہشت گردی ہو یا گیانا کی دہشت گردی دونوں صورتوں میں تارکین وطن اور ان کی اولاوں کو امریکی سرزمین میں بے شناختی کا سامنا کرداروں کو کرنا پڑتا ہے ان کی شناخت سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی ہے۔ بنا کسی جرم کے مسلمان اور دوسرے ممالک سے تعلق کی وجہ سے مشکوک اور مجرم سمجھے جاتے ہیں۔ دہشت گردی کا جرم بالخصوص مسلمانون کی ذات سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مصنفہ نے گیارہ ستمبر کے تاریخی سانحے کی یاد میں ناول "طاؤس فقط رنگ" کے علاوہ ستمگر ستمبر کے عنوان سے رپوتاژ بھی لکھتی ہیں۔ جس کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر عادل حسین لکھتے ہیں:

> ہر بڑا واقعہ ایک بڑے رد عمل کا محرک بنتا ہے اگر کبھی ۱۱ /۹ پر مقالہ لکھا گیا تو نیلم کی تحریروں کی شمالیت اور تجربے کے بغیر یہ کام نامکمل اور پھیکا رہے گا۔[۱]

ناول کا بنیادی موضوع گیارہ ستمبر کے سانحے کے رد عمل میں امریکہ میں قیام پزیر تارکین وطن کی شناخت کا بحران ہے۔

> نیلم احمد بشیر کا ناول طاؤس فقط رنگ امریکہ کے پس منظر میں جدید انسان کی شناخت کا بحران ہے۔[۲]

شناخت کا تعلق مربوط نظام حیات کے ساتھ وابستہ ہے جس میں کسی فرد کی شناخت کے مختلف پیمانے ہوتے ہیں جیسے کرداروں کی ذات سے وابستہ شناخت، مذہب سے مسلک شناخت، خطے، رنگ و نسل، زبان بیان سے جڑی شناخت ہے۔ کب کوئی کردار عدم تحفظ کا شکار ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اس کا کیا کردار ہے؟ معاشرے میں اس کی کیا حیثیت ہے جب وہ ان سوالات کے جوابات نہیں دے پاتا تو یہ الجھن یہ کش مکش اسے شناخت کے بحران میں مبتلا کرتی ہے جیسے ناول میں دیگر مقامات پہ کردار بے شناخت بے یقینی کے سوالات اٹھاتے ہیں۔ مصنفہ مسلمان تارکین وطن کی زندگیوں میں درپیش مشکلات، معاشی بحران، معاشرتی بحران، نفسیاتی بحران اور شناختی بحران کو حقیقت کی رنگا رنگی اور تخیل کی آمیزش سے موضوع بناتی ہیں۔ مصنفہ ناول میں کرداروں کے زریعے سے امریکی معاشرے میں مسلمانوں کی زندگیوں کی مشکلات کو بیان کرتی ہیں ان کے لیے دہشت گرد F.O.B کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں

یعنی فکر معاش میں اور بہتر سہولیات زندگی کے لیے کشتی کے ذریعے آئے ہوئے لوگ جو امریکی طرز معاشرت سے اور مغربی تہذیب سے ناآشنا ہوں۔ گیارہ ستمبر امریکہ کی سرزمین پر المناک ناقابل فراموش دن ہے جس کے اثرات نہ صرف امریکہ بلکہ تمام دنیا پر مرتب ہوئے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دہشت گردی عالمی سیاست کے منظر نامے کو متاثر کیا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی بلند و بالا عمارت میں تقریباً ہر رنگ و نسل اور ہر خطے سے تعلق رکھنے والے افراد کام کرتے ہیں۔ عمارتوں کے فلک بوس ہونے سے سب سے پہلے مسلمانوں کی شناخت مشکوک ہو گئی اور پھر مسلمان تارکین وطن امریکی سرزمین پر معاشی بحران کا شکار ہوتے ہیں اس ناول کے موضوع کے بارے میں مسز شاہ رشید لکھتی ہیں کہ

> اس ناول کا بنیادی موضوع ۱۱/ ۹ حادثے کے بعد امریکہ میں مقیم تارکین وطن کو پیش آنے والے مسائل ہیں کس طرح انھیں شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مسلمان دہشت گردی کی علامت سمجھے جانے لگے۔ کمپنیوں سے دھڑا دھڑ غیر ملکیوں بالخصوص مسلمانوں کو بے دخل کیا جانے لگا۔ بے روز گاری بہت بڑھ گئی سخت معاشی مسائل کا سامنا تھا۔ بے یقینی کی فضا قائم ہو گئی۔۔۔ غیر ملکیوں کو F.O.B جیسے القابات سے نوازا جانے لگا۔[۸]

ناول میں مصنفہ نے تارکین وطن اور ان کی اولادوں کی زندگی میں گیارہ ستمبر کے بعد درپیش شناختی مسائل کو موضوع بنایا ہے مسلمان تارکین وطن کی اولادیں جو کہ اور پیدائشی امریکی ہیں لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد وہ امریکی شہری کی شناخت اور وہ حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ امریکیوں کی نظروں میں تارکین وطن اور خاص طور پر مسلمان تارکین وطن کی حیثیت کو دہشت گرد اوران کے لیے غیر مہذب جیسے القابات کا استعمال کرتے ہیں۔

مسلمان تارکین اور ان کی اولادیں گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد جب بے روز گار ہوئیں تو مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں ملازمت نہیں ملتی کیوں کی مسلمانوں کی شناخت امریکیوں کی نظروں میں محض دہشت گرد کی ہو گئی۔ مصنفہ ناول میں بیان کرتی ہیں کہ بلا آخر تھک ہار کر ناول کا مرکزی کردار گائی نیز فیملی کے ہاں ڈرائیور کی ملازمت اختیار کر لیتا ہے دونوں بوڑھے ماں باپ کا خیال رکھتا ہے لیکن ان کی بیٹی جو تعلیم کے حصول کے لیے دوسرے شہر رہتی ہے اس کا پاکستان سے تعلق سن کر فوری پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ اسے مشکوک سمجھتے ہوئے دہشت گرد سمجھتی ہے دراصل مصنفہ کرداروں کی مدد سے ان کی بے شناختی کو بیان کرتی ہیں جب وہ اپنے ہی ملک میں غیر اور دہشت گرد سمجھے جاتے ہیں جس ملک میں انھوں نے جنم لیا۔ اسے اپنا سمجھتے ہوئے اور اس پر فخر کرتے تھے گیارہ ستمبر کے سانحے نے ان سے اس کی شناخت چھین لی۔

جیسے کہ ناول کا مرکزی کردار تارکین وطن کی اولاد لیکن پیدائشی بارن امریکن ہے اور بارن امریکن ہونے پر ہمیشہ فخر محسوس کرتا ہے لیکن گیارہ ستمبر کے بعد اس سے امریکن بارن ہونے پر فخر کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا ۔ اسے امریکن تسلیم نہیں کیا جاتا اور وہ خود کو پاکستانی نہیں کہہ سکتا۔ گیارہ ستمبر کے بعد بے روز گار ہو کر بلاآخر ایک گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ملازمت اختیار کرتا ہے لیکن وہاں ساتھ بھی اس کا تعلق پاکستان اور اسلام کے ساتھ ساتھ دہشت گردی سے جوڑا جاتا ہے۔ گھر کے مالکن کی بیٹی کی باتوں سے امریکن رویوں اور سوچ کی عکاسی ہوتی ہے اور مسلمان تارکین کے جوڑے اور ان کے بیٹے کی بے بسی سے مصنفہ مسلمان تارکین وطن کی بے بسی اور بے

شناختی کو بیان کرتی ہیں۔ مالکن کی بیٹی مراد سے کہتی ہے۔

تم پاکستانی ہو اور پاکستانی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ابھی نائن الیون کا زخم تازہ ہے۔۔ تمہارا کوئی کریمنل ریکارڈ ہے تو میں کمپیوٹر پر چیک کر لوں گی۔ ویسے بھی (F.O.B) لوگوں پر آسانی سے اعتماد نہیں کرتی۔[۹]

مسلمان پاکستانی ترک وطن جو اپنا وطن ترک کر کے امریکہ آ گئے اور یہی قیام پزیر رہے ان کی اولادیں امریکہ میں ہی پیدا ہوئیں ان کا وطن تو امریکہ ہی تھا انھیں پاکستان سے کوئی وابستگی تھی نہ ہی وہ پاکستان کو اپنا ملک سمجھتے تھے محض پاکستانی جوڑے کی اولاد ہونے کے باعث انھیں اس جرم کی سزا دی جاتی ہے جو ان سے سرزد ہوا ہی نہیں۔ دہشت گردی کا نام استعمال کر کے امریکہ نے کمزور مسلمان ممالک پر اپنی گرفت مضبوط کی ہے۔ جب وہ دہشت گردی کے الزام میں جیل جاتا ہے اس کے ساتھ جیل میں موجود امریکن مجرموں کا متعصبانہ رویہ اسے اپنے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے آخر وہ جائے تو کہاں جائیں اس کی شناخت کیا ہے اور امریکی ملک میں اس کی حیثیت اور شناخت اب امریکن بارن کے بجائے دہشت گرد کے طور پر ہے جب مراد جیل میں خود کو امریکن بارن کہتا ہے تو امریکن مجرم اسے مارتے ہیں مصنفہ اس صورت حال کو یوں بیان کرتی ہیں۔

مام یہاں کچھ قیدیوں نے مجھے یوں دہشت گرد پکار کر چھیڑنا، مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ آتے جاتے مجھے مسلم ٹیرسٹ کہہ کر تھپڑ جڑ دیتے۔ میں نے کہا میں بارن امریکن ہوں تو انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔[۱۰]

گیارہ ستمبر کے سانحے کے رد عمل میں امریکی سرزمین پر ایسی منہ زور لہریں اٹھی ہیں جس کی دھند پوری دنیا میں چھا گئی۔ طاؤس فقط رنگ مصنفہ کا ایک ایسا ناول ہے جس میں اپنے عہد کی صورت حال کی عکاسی کے ساتھ گزرے عہد کے سانحے اور اس کے باعث پیدا کردہ کرداروں میں شناختی بحران کو بیان کرتی ہیں۔ گیارہ ستمبر کے پس منظر میں غیر امریکیوں کی شناخت کا بحران، شکوک و شبہات کا سامنا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد جلد ہی تمام امریکن چینل بنا کسی تحقیق سے پہلے ہی شک کی بنیاد پر مسلمانوں کو اس سانحے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جس سے مسلمان تارکین وطن کا امریکہ میں پر وقار زندگی گزارنے کا خواب بری طرح ٹوٹ کر ان کی روح کو گھائل اور جسم کو بے شناخت کر دیتا ہے۔

نائن الیون کی اصلاح کے ساتھ ہی تارکین وطن بالخصوص مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگتا ہے جس سے ان کے اندر بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس جنم لیتا ہے جیسے

کہ ناول طاؤس فقط رنگ کے کرداروں کے ذریعے مصنفہ اس صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں۔ مصنفہ شعوری اور لاشعوری طور پر دونوں معاشروں مشرق اور مغرب کا کہیں نہ کہیں تقابل کرتے ہوئے دونوں تہذیبوں کے مابین تصادم اور دونوں معاشروں کی خوبیوں اور کمزوریوں کو بیان کرتی ہیں۔

منیر احمد فردوس طاؤس فقط رنگ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

> انسانی رویوں کی ٹوٹ پھوٹ کا بیان، دو معاشروں کی کہیں نہ کہیں تقابلی حالت کا قصہ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے شب و روز کی داستان۔ اور بڑی سطح پر دیکھیے تو امریکہ کی بیرونی طاقت و دہشت گردی اور اندرونی کمزوریوں کا احوال بھی ناول میں بین السطور سانس لیتا ہے۔[۱۱]

وہ لوگ جو پیدائشی امریکن تھے جن کے والدین اپنا وطن گھر بار سب کو خیر آباد کہہ کر امریکہ کو اپنا چکے تھے ان کی اولادوں نے امریکی سرزمین پہ ہی جنم لیا اسے اپنا ملک سمجھا اس کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں جیسے کی جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ ہوتا ہے تو ناول کا ایک مسلمان پاکستانی کردار سب لوگوں کی مدد کرتا ہے اور خود جان کی بازی ہار جاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد ایک پل میں تارکین وطن غیر ہو گئے۔ اجنبیت کی ایسی دیوار ان کے درمیان حائل ہو گئی جس کے پیچھے تارکین وطن کی شناخت چھپ جاتی ہے۔ اور ان کے ماتھے پر دہشت گردی کا ٹیکا لگ گیا۔ نیو یارک شہر میں اتنے بڑے پیمانے پر تباہی دنیا بھر کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مصنفہ اس سانحے سے متعلق کئی طرح کے سوالات اٹھاتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے پیچھے کیا محرکات پوشیدہ ہیں ان کی نشاندہی ہلکے پھلکے انداز میں کرتی ہیں۔

گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد امریکی معاشرے میں مسلمانوں کی طرزِ، معاشرت میں تبدیلی، خوف وہراس، تذبذب، الجھن اور بے یقینی کی کیفیت اور تارکین کے ہاں عدم تحفظ کے احساس کو موضوع بناتے ہوئے ان کی شناخت کے مسائل کو خوبصورت اندازِ بیان میں رقم کیا ہے جس سے تارکین کی گیارہ ستمبر کے بعد بدلتی صورتحال میں طرزِ معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔

مصنفہ گیارہ ستمبر کے بعد امریکی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے مسلمان تارکین اور ان کی اولادوں کی زندگیوں پر اثرات کو موضوع بناتے ہوئے امریکیوں کی تنگ نظری اور رنگ و نسل کے امتیاز اور مذہبی تعصب کو بیان کرتی ہیں۔

مصنفہ نے ناول میں امریکی معاشرے کے مثبت اور تاریک دونوں پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے اپنے مشاہدات کی روشنی میں بنا کسی تعصب کے بیان کیا ہے۔ مصنفہ خود بھی ترک وطنی کے تجربات سے گزری

ہیں۔ اس لیے وہ تارکین کے سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، نفسیاتی اور شناختی مسائل کا باخوبی ادراک رکھتی ہیں۔ اور ان مسائل کو نئے رخ کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

مصنفہ کی فکر میں پختگی پائی جاتی ہے اور اسلوب کی سادگی اور تکنیکوں کے استعمال سے کلام میں مزید جدت پیدا ہوئی ہے۔

مصنفہ نے کئی تہذیبو ں کے افراد کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لاکر کرداروں کی زبانی اس نے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ وہ گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے بارے میں کیا نظریات رکھتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد ناول کا مرکزی کردار واک کرتے ہوئے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر مین ہٹن کا نظارہ کرنے کی غرض سے نکلتے ہیں ۔جنھوں نے شلوار قمیض زیب تن ہوتی ہے جس کی وجہ سے اسے امریکن لوگوں کی نفرت آمیز نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لوگ عجیب نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہیں ۔ سجیلہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہوئے سوچتی ہے اسے امریکن لباس پہن کر آنا چاہیے تھا۔

مسلمان تارکین وطن خود کو مسلمان یا پاکستانی کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں امریکی معاشرے میں دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ سجیلہ اور مراد بنا کسی جرم کے امریکیوں کی نظروں میں مجرم ٹھہرتے ہیں۔ امریکہ میں جنم لینے کی وجہ سے خود کو گوروں سے کم محسوس نہیں کرنے والے کردار بھی اس سانحے کے بعد درپیش صورت حال سے ان پہ یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہاں کی پیدائش کے باوجود یہ معاشرہ انھیں اپنانے سے انکاری ہے۔ اور ان کی یہاں کوئی شناخت اور حیثیت نہیں ہے۔

طـــاؤس فقـــط رنـــگ کے کرداروں کی مثال ان پودوں کی سی ہے جن کی جڑوں کو اکھاڑ دیا جائے۔ آخر بنا جڑوں کے پودا کب تک کھڑا رہ سکتا ہے بلآخر اوندھے منہ زمین پر گرتا ہے۔ ایسے ہی ان کرداروں کا بے شناخت ہو کر امریکی معاشرے میں زندگی کا قیام عمل میں لانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مصنفہ تارکین وطن کے سب سے بڑا مسئلہ شناختی بحران کو بیان کرتی ہیں ہے جس کے بعد وہ کئی طرح کے دوسرے مسائل سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں جیسے تارکین معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور تہذیبی و ثقافتی بحران کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ تارکین کے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ میں پیدا ہونے والے ان کے بچے اب کہاں جائیں؟ کس کو اپنا ملک سمجھیں گے ۔ مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ

نائن الیون ۔۔۔انتقام، حملے، نفرتیں، تعصبات، اختلافات، الزام تراشیاں، بندشیں، ایک عجب سے نامہرباں دور کا آغاز ہو چکا تھا" ۔۔۔"اب ہم جیسے امریکن بارن بھی سیکنڈ سٹیزن بن چکے ہیں۔ ہمیں اپنے ہی ملک میں یہ سب برداشت کرنا ہو گا۔[۲۱]

طاؤس فقط رنگ پیدائشی امریکی ہجرت زدہ غیر ملکیوں کی بے شناختی کا قصہ ہے جہاں کردار اپنے بقاء کی جستجو میں بھٹکتے اپنی شناخت کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ جب کوئی فرد اپنے معاشرے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں زندگی بسر کرنے جاتے ہیں وہ اپنے اور اس معاشرے میں فرق پاتے ہیں۔ طرزِ معاشرت کا فرق، رہنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، خاص طور پر تہذیبوں اور عقائد کا فرق ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں مصنفہ دو طرح کے کرداروں کے زریعے اپنی فکر کو بیاں کرتی ہیں۔

ناول میں ایک طرح کے وہ کردار ہیں جو اپنے طرزِ حیات کو چھوڑ کر ان کے مطابق چلتے ہیں ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک طرح کے وہ کردار ہیں جو امریکہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی پاکستانی شناخت پر فخر کرتے ہیں خود کو پاکستانی کہتے ہوئے شرم محسوس وغیرہ مصنفہ ان کی مدد سے تارکین کے نظریات و افکار اور ان کی طرزِ حیات کو موضوع بناتی ہیں۔

جب گیارہ ستمبر کا سانحہ پیش آتا ہے اور امریکہ کی نظروں میں اس سانحے کا ذمہ دار القاعدہ کا لیڈر اسامہ بن لادن قرار دیا جاتا ہے تب امریکہ میں مسلمان تارکین کردار خود کو پاکستانی مسلمان کے طور پر پہچان کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں جس کے باعث مسلمانون کو نفرت اور ناپسندگی سے دیکھا جاتا ہے۔

میڈیا نفرت کا ایسا بیج بو دیتا ہے جس کا اثر مسلمان تارکین کی اولاوں پر بھی برا پڑتا ہے جیسے ناول کا مرکزی کردار مسلمانوں کے بارے میڈیا کی طرف سے سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے مسلمانوں کو امن کا دشمن اور دہشت گرد کہتا ہے۔ لیکن سجیلہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کرتے ہوئے کہتی ہے امریکی خود سب سے بڑے دہشت گرد ہیں جنھوں نے خود یہ ملک ریڈ انڈ ئنز سے چھینا تھا۔ گیارہ ستمبر کے حملے کی نہ صرف امریکن بلکہ مسلمان بھی بھر پور مذمت کرتے ہیں اس دکھ کی کھڑی میں امریکہ سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن امریکیوں کی آنکھوں میں مسلمانوں سے متعلق شکوک و شبہات کی بندھی پٹی نہیں اترتی۔

تارکین وطن اور ان کی اولادیں اپنے ہی ملک میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں جب انھیں غیر اور دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ اپنا لباس پہنتے ہوئے کردار خوف زدہ محسوس ہوتے ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کے حلیے سے پہچان کر کڑیاں جوڑتے ہوئے کئی دہشت گرد نہ سمجھ لیا جائے۔ خوف، تنہائی، بے چینی، عدم تحفظ کا احساس، اجنبیت

کی فضا، اور مصنفہ کرداروں کی داخلی و خارجی کیفیات کا اظہار کرتی ہیں۔ نائن الیون کے ملبے تلے تارکین کرداروں کی شناخت دھب گئی اس ملبے کی دھول ان کے ساتھ لپٹ کر انھیں بے شناخت اور خوف زرہ کر دیتی ہے جہاں کردار اپنے حقوق کے لیے بولتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مصنفہ ناول میں لکھتی ہیں

مگر آج بساط الٹ چکی تھی امریکہ میں جنم لینے بھی مجرم اور اجنبی سمجھے جانے لگے۔ [۳۱]

گیارہ ستمبر کے اثرات ساری دنیا پر مرتب ہوتے ہیں اور سرد جنگ کا نقشہ ایک بار پھر سے ابھرتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں کے جذبات پیدا ہوئے انتقام کی آگ میں جل کر کرداروں کی شناخت راکھ ہو جاتی ہے۔ تارکین روزگار کی تلاش میں اور ابتداء میں خود امریکن نے ہندوستان سے غریب و بے روزگار لوگوں کو وہاں لے گئے اور ان سے کام لے کر غیر آباد جگہوں کو آباد کروایا۔ کئی افراد اس طرزِ معاشرت کو اپنا نہیں پاتے یہ فرق ان کی اور ان کی اولادوں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ دوہری شخصیت اپناتے نظر آتے ہیں۔

مصنفہ اس ناول میں سوالات اٹھاتے ہوئے قاری کی سوچ کو نیا رخ دیتی ہیں جس سے قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کردار بے شناختی کے باعث خود بخود احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ترک وطن کردار دوہرائے پہ کھڑے بے یقینی کی کیفیت میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں۔ شناخت کے مسئلے کا اثر کرداروں پر یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر دو عملی کے راستے پر چل پڑتے ہیں جہاں ان کی دہری شخصیت کے باعث ان میں قول و فعل کا تضاد جنم لیتا ہے۔ رنگ، نسل، مذہب، زبان، لباس، تہذیب، نظریات و انکار میں فرق تارکین وطن کے لیے شناخت کے مسئلے کو فروغ دیتا ہے۔

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اپنی شناخت چاہتا ہے اپنے لیے مقام و مرتبے کی خواہش کرتا ہے۔ شناخت کا تعلق طاقت کے احساس کے ساتھ بھی عیاں ہوتا ہے اور طاقت کے ساتھ خوف کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسے کے ناول میں ڈی کا کردار ہے۔

وہ امریکن ہے عیسائی پادری جم جونز کی بیٹی وہ امریکی شناخت رکھتی ہے اس لیے برتری کا اظہار کرتی ہے۔ ڈی خود مراد سے تعلق رکھنا چاہتی ہے مراد کی طرف سے انکار کی صورت میں ڈی مراد پر ہراسمنٹ کا الزام لگاتی ہے اور مراد کے خلاف رسٹرینگ آرڈر لیتی ہے۔ مراد جب پولیس آفیسر کو بتاتا ہے کہ وہ نہیں بلکہ ڈی خود اس کے ارد گرد گھومتی ہے اس کے گھر آتی ہے تب پولیس آفیسر اسے قانونی نقطہ سمجھاتے ہوئے رسٹرینگ آرڈر لینے کا مشورہ دیتا ہے لیکن اس کی نظروں میں مراد کے لیے شکوک و شبہات کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ کیوں کہ مخالف میں سفید فام

لڑکی ہے اس لیے سفید فام پولیس آفیسر کی نظروں میں مجرم مراد ہی ہے۔ مصنفہ ناول میں اس صورت حال کو یوں بیان کرتی ہیں۔

اس کی نگاؤں میں شک کوٹ کوٹ کر بھرا تھا

سفید فام آفیسر نے سر سے پیر تک جانچتے ہوئے کہا۔[۱۴]

گیارہ ستمبر کے سانحے کے مسلمان تارکین کی شناخت مشکوک ہونے کی وجہ سے ذرا سی لرزش ان کے لیے ناقابل معافی جرم بن جاتا ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتی ڈی مراد کے خلاف شکایت کرتی ہے کہ وہ پاکستانی دہشت گرد ہے اس نے ایک بار میری کار کے نیچے بم نصب کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ کہ مراد امریکہ سے نفرت کرتا ہے۔ ہر وقت امریکہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے یہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے والے دن کام پر نہیں آیا تھا اس کی بھی تفتیش کروائی جائے۔ مصنفہ اس واقع سے امریکی معاشرے میں مسلمانوں کی بے وقعتی، بے شناختی اور شکوک و شبہات میں گھرے، بے حیثیت، بے توقیر اور غیر محفوظ ہونے کا المیہ موضوع بناتی ہے۔

مسلمان تارکین اپنی شناخت کھو کر اس قدر بے بس ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی ذاتی عناد و عداوت کا بدلہ ان سے دہشت گردی کا الزام لگا کر لے سکتا ہے اور عدالت اس مقدمے کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔ مراد کو آفیسر گرفتار کرتا ہے سجیلہ اپنے بیٹے کی حمایت میں بولتی ہے کہ اس لڑکی کو بھی گرفتار کریں۔ بتاتی ہے کہ وہ لڑکی کیسے اس کی فیملی کو تنگ کرتی ہے مراد امریکن بارن ہے اسے اپنے ملک سے پیار ہے اس کے بھی حقوق ہیں اسے بھی تحفظ ملنا چاہیے۔ لیکن سجیلہ کی بات کوئی نہیں سنتا۔ سجیلہ کہتی ہے'

پلیز آفیسر، میرے بچے امریکن ہیں، یہیں پیدا ہوئے۔ میرا بیٹا مذہبی فناٹک یا دہشت گرد نہیں ہے۔[۱۵]

امریکن بارن ہونے پر فخر کرنے والوں تارکین کی اولادوں کی حیثیت بھی معمولی کیڑے مکوروں سے زیادہ نہیں رہتی خاص طور پر مراد جب دہشت گردی کے الزام میں جیل جاتا ہے اسے دوسرے ملزم دہشت گرد اور اس کی ماں پر بھی تنقید کرتے ہوئے امریکہ چھوڑ کر واپس جانے کا کہتے ہیں۔ مصنفہ مختصر اور سادہ انداز میں اس واقع سے امریکی معاشرے میں موجود تارکین کی اس معاشرے میں بے وقتی اور بے شناختی کو اس پرائے میں بیان کرتی ہیں کہ قید میں موجود مجرم بھی کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے آئے ہوتے ہیں لیکن وہ بھی خود سے بدتر مسلمان تارکین کو جانتے ہیں اور نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں انھیں امریکہ چھوڑ کر اپنے ملک جانے کا کہتے ہیں اب اس صورت حال کے پیش نظر تارکین کے لیے نہ ہی امریکی معاشرے میں کوئی جگہ بچتی ہے نہ ہی آبائی

وطن جاسکتے ہیں۔ تارکین اور ان کی اولادیں کس ملک کو اب اپنا جانیں؟ کہاں جائیں؟ ان کی اصل کیا ہے اور ان شناخت کیا؟ سب کچھ سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ مراد کے پاس سے گزرتے ہوئے ملزم اسے چھیڑتے ہیں۔

مراد ایک ننھے بچے کی مانند خوف زدہ تھا۔۔دیکھو مسلم ٹیررسٹ کی ماں بھی آئی ہوئی ہے Hey you

we hate tou تم لوگ اپنے ملک کیوں واپس نہیں چلے جاتے۔۔ [16]

ناول طاؤس فقط رنگ میں مصنفہ کا بنیادی موضوع شناخت کا بحران ہے جو کہ ناول میں دو اہم سانحوں کے پیش نظر ابھرتا ہے ابتدا میں مصنفہ نے گیارہ ستمبر سے سانحے کے باعث تارکین کرداروں کی بے شناختی کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس ناول میں دوسرا اہم سانحہ جو مصنفہ فلیش بیک میں پیش کرتی ہیں وہ گیانا کا المیہ ہے۔ جسے مصنفہ حقیقت کی چاشنی اور تخیل کے ملاپ سے موضوع بناتی ہیں۔

گیانا خوبصورت سرسبز وشاداب جزیرہ ہے۔ گیانا سے تعلق رکھنے والے کرداروں میں مسٹر چین (لیو) جو کہ عیسائی ہیں اور اس کی بیوی قمر النساء (سوَ) جو کہ مسلمان خاتون ہیں جس کے آباؤ آجداد ہندوستان سے ہجرت کر کے امریکہ گئے تھے۔ مصنفہ مسز چین کے زریعے فلیش بیک کی تکنیک اپناتے ہوئے حال سے ماضی کی یاد میں محو کے زریعے سے گیانا المیہ اور کیمون میں کرداروں کی زندگی میں نشیب و فراز اور بے شناختی کو بیان کرتی ہیں۔

کیسے کیلی فورنیا سے ایک شخص اٹھا جب ہر قسم کی شخصی سیاسی اور جنسی آزادی کے نعرے عروج پر تھے امریکن سکون کی تلاش میں نشہ اور ادوایات کا استعمال اور آئیڈیل ازم اور کسی خیالی جنت کی طلب میں ادھر ادھر بھٹکتے پھیرتے ہیں اور نیویارک سٹیٹ کے مشہور میوزک کنسرٹ میں فلاور چلڈرن کے نام سے اپنی شناخت بنا کر اپنی آزادی کی خواہش کرتے ہیں۔ جم جونز ایک مضبوط اور جادوائی طاقت کا حامل کردار ہے جو امریکیوں کے سیاست اور نسلی تعصبات اور کیپٹل ازم وغیرہ کو غلط قرار دیتے ہوئے اپنے خیال و افکار کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے ہمراہ ایک آئیڈیل دنیا بسانا چاہتا ہے۔ جم جونز ایسے جزیرے کا نقشہ پیش کرتا ہے جہاں کسی گورے کالے کی تفریق نہ ہو۔ جم جونز گیانا جزیرے کا رخ کرتا ہے۔ گیانا میں کیمون کو سخت اور کڑی نگرانی میں رکھا جاتا ہے ان کے چاروں اطراف میں خاردار تاریں لگادی جاتی ہیں تاکہ لوگ بھاگنے نہ پائیں۔

مصنفہ کیمون کے کرداروں کے زریعے اس بات کو قاری پر واضح کرتی ہیں کہ جب کسی فرد یا افراد سے اس کی آزادی چھین لی جاتی ہے وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کے فیصلے نہیں کر سکتے تو ان کرداروں میں شناخت کا مسلئہ پیدا ہوتا ہے۔ شناخت کے مسئلے کے پیچھے چھپے سیاسی و استعماری صورت حال بھی جامع انداز میں پیش کرتی ہیں۔ جب جم جونز کے نافذ کردہ قوانین کیمون کے بسنے والوں پر زبردستی مسلط کر دیئے جاتے ہیں جب طاقت کے نشے میں سرشار

کمزرور کرداروں کے حقوق کا استحصال کرتا ہے تو شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔وہ اپنی ذات سے متعلق کئیں سوالات ذہنوں میں لیے پھیرتے ہیں۔ذہنی انتشار، بے چینی اور بے جاپابندیوں میں جھکڑے کرداروں میں بغاوت جنم لیتی ہے۔کیوں کہ اپنی شناخت کا انسان پیدائش سے ہی متلاشی ہوتا ہے اور یہ انسان کا پیدائشی حق اور فطری جذبہ ہے ہر انسان اپنی انفرادیت کی بقاء چاہتا ہے اپنے وجود کا تشخص اور تحفظ چاہتا ہے۔جب کسی کو بہت زیادہ دباؤ اور خوف میں رکھا جاتا ہے تب بھی وہ باغی ہو جاتے ہیں جیسے کے مصنفہ گیانا کے کرداروں کو پیش کرتی ہیں۔شناخت کا طاقت کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔طاقت ور کمزور سے اس کی شناخت چھین کر اپنی مرضی کی شناخت عطا کرتا ہے۔

ایک طرف مصنفہ گیارہ ستمبر کے سانحے کے پیش نظر مسلمان تارکین وطن کی بے شناختی کو بیان کرتی ہیں جن پر زبردستی دہشت گردی کی شناخت تھونپی جاتی ہے دوسری طرف جم جونز گیارہ کے باشندوں کی زندگیوں پر اپنے بنائے گئے قوانین اپنی مرضی کی شناخت مسلط کرتا ہے۔مصنفہ ان دونوں المیوں میں بے بس کمزرور کرداروں کی بے شناختی کو یوں بیان کرتی ہیں کہ تمام صورت حال کی الجھی گتھیاں قاری پر کھلتی چلی جاتی ہے۔گیانا میں پہلے افراد جسمانی غلامی اور پھر رفتہ رفتہ ذہنی طور پر انھیں غلام بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ان کی اخلاقیات واقدار کی قدروں کی پامالی انھیں بغاوت پر اکساتی ہے کہ وہ اپنی الگ شناخت حاصل کریں جیسے کے ناول مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ جم جونز گیانا کے باشندوں کو آزادانہ جنسی عمل پر مجبور کرتا ہے۔

> گیانا کے کیمون میں لوگوں کو کڑی نگرانی میں رکھا جاتا چاروں طرف خاردار تاریں۔۔سب کو ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ جنسی تعلقات رکھنے کی اجازت۔۔خود وہ جسے چاہتا خواب گاہ میں طلب کر لیتا اور کہتا 'میں تمہارا خدا ہوں'' ایک روز اس نے سب کو نئے نام اور شناخت دینے کی تقریب منعقد کی۔[۱۷]

کرداروں سے ان کے مذہبی عقائد و نظریات، رسم ورواج، روایات واقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی چھین جاتی ہے۔خاص طور پر مسلمان کرداروں کی شناخت شدید متاثر ہوتی ہے۔مصنفہ نے ناول میں گیانا المیے کے متاثرہ میں سے دو اہم کردار مسٹر چین اور مسز چین کو درپیش صورت حال کو بیان کرتی ہیں۔مسٹر چین جنھیں جم جونز کی طرف سے سؤ کا نام دیا جاتا ہے۔اور مسز چین کو جم جونز کی طرف سے لیو نام دیا جاتا ہے۔جم جونز سب کو نئے نام اور نئی شناخت دیتا ہے اور ان سے ان کے اصل نام اور شناخت چھین لیتا ہے۔ان کی حیثیت محض غلام کی سی ہے جن پر ہر وقت ایک آقا جم جونز کی صورت میں مسلط رہتا ہے۔خوف اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے لیکن مسز چین بعض اوقات ایک مضبوط عورت کے روپ میں ڈٹ جاتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی جم جونز کے ظلم و ستم

سہنے کے بجائے بغاوت پر اکساتی ہے۔ مسٹر چیین مسز کی نسبت ایک کمزور کردار کے طور پر نظر آتا ہے جو جم جونز کے خوف سے ناچاہتے ہوئے بھی سب کچھ کرتا ہے لیکن بغاوت نہیں کرپاتا۔

مسز چیین ایک مسلمان عورت ہے اپنے مذہبی عقائد کے باعث وہ جم کے قوانین پر عمل نہیں کرنا چاہتی وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے فرد سے جسمانی تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتی اس کا مذہب اسے اس عمل کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ ہی وہ خود اپنے محبوب شوہر سے بے وفائی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتا یہ کرب کہ ناچاہتے ہوئے بھی اپناوجود جم جونز کو سونپنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو گیانا سے بھاگ کر دور کسی جگہ جانے کی ترغیت دیتی ہے۔ جب افراد سے ان کی آزادی چھین لی جاتی ہے ان کے حقوق کا یوں استحصال ہوتا ہے وہ داخلی گھٹن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا اپنی شناخت کے حوالے تلاش کرتے ہیں۔

مسز چیین دوسروں کی طرح جم جونز کو خدا نہیں سمجھتی محض ایک انسان سمجھتی ہے۔ یہ کردار اپنی الگ شناخت چاہتا ہے جو کہ ہر انسان کا بنیادی حق اور فطری بات ہے۔ ہر فرد معاشرے میں اپنی مخصوص پہچان چاہتا ہے لیکن جم جونز کرداروں کی ہر طرح کی آزادی ختم کرکے انھیں اپنا غلام بنا کر ان کی شناخت مسخ کر دی جاتی ہے۔ جس سے کرداروں کے اندر بغاوت جنم لیتی ہے وہ خود کو اس قید سے رہا کروانے کے لیے چھپ کے امریکی حکومت کو خط لکھتے ہیں۔ قمر النساء اپنے شوہر کو بھی بغاوت پر اکساتی ہے اس لحاظ سے یہ مضبوط اور باشعور کردار ہے۔ وہ اپنی خودی کو جم جونز کے ہاتھوں پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ مصنفہ اس دور کی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور جذباتی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔ مصنفہ گیانا کے داخلی و خارجی ماحول کے انتشار اور اس کے باعث معاشرے کی بدلتی ہوئی حالتوں کے پیش نظر کرداروں کے شناختی بحران کو بیان کرتی ہیں۔

جم جونز خود کو بہتر خیال کرتے ہوئے دوسری شناخیوں کو کم تر سمجھتے ہوئے کم درجہ دیتا ہے۔ طاقت ور اور کمزور کے درمیان، حق و باطل، ظلم و نانصافی، حقوق کی استحصالی اور کمتری شناخت کے مسئلے کو پروان چڑھاتی ہے۔ شناخت محض کسی کردار اظہارے تک محدود نہیں بلکہ ناول کا ہر کردار شناخت کے مسلئے سے دوچار نظر آتا ہے۔ شناخت کے مسلئے کو مصنفہ کرداروں کی ذات سے لے کر ان کے معاشرے میں ان کی داخلی کیفیات اور خارجی پہلوؤں کو بھی بیان کرتی ہیں۔ گیانا کے وہ کردار جو جم جونز کے ماتحت ہیں وہ اپنی شناخیوں کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ مسلسل استحصال اور بدامنی کی زد میں کڑی نگرانی میں رکھے جاتے ہیں ان کے اندر بے شناختی اور عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔

مصنفہ گیانا میں جم جونز کے حکم کی تکمیل اجتماعی کو خودکشیوں کی ریہرسل میں حقیقی موت سے ہمکنار ہونے والے معصوم بے شناخت کمیون کے المیے کو موضوع بناتی ہیں۔ خودکشیوں کی ریہرسل میں کول ایڈ میٹھے شربت کی بھری ہوئی بالٹیاں لائی جاتی ہیں جن میں نشہ ور دوا شامل کی جاتی ہے جس کے نشے میں پینے والے مسرور ہوتے ہیں اور یوں جم جونز اپنی مصنوعی جنت کی سیر کرواتا ہے۔ گیانا کے دو اہم کردار مسٹر چین اور مسز چین یعنی سو اور لیو ہیں۔ سو اور لیو کے ہاں بچیوں کی پیدائش پر جم جونز انھیں بچیوں کو گیانا جنگلیوں کے پھول کے نام پر میری گولڈ اور انجلیکا نام دیتا ہے۔

خودکشیوں کی ریہرسل کرنے والے کے شربت میں سایائیڈ زہر مکس کر دیا جاتا ہے جس سے شربت پینے والوں کی اموات واقع ہو جاتی ہیں۔ کچھ چھپ کر وہاں سے گیانا کے جنگل کی طرف بھاگ جاتے ہیں پکڑے جانے والوں کو جم جونز کی طرف سے سخت سزا دی جاتی، جان بچا کر کامیابی سے بھاگ جانے والوں میں لیو اور سو بھی بچیوں کے ہمرا شامل ہوتے ہیں۔ میری گولڈ گیانا کے جنگل میں کھو جاتی ہے یہاں سے اس کی بے شناختی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ لیو اور سو بھی اپنی شناخت بدل کر رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ زندہ بچ جانے والے بے شناخت دوہری شناخت اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نام انسان کی پہچان ہوتی ہے لیکن یہاں گیانا سے متاثرہ افراد اپنے اصل نام اور شناخت کو چھپاتے ہیں جیسے کہ سو اور لیو مسٹر چین اور مسز چین کے نام سے جانے جاتے ہیں انجیلکا کا نام بدل کر شیری رکھ دیا جاتا ہے۔ انجلیکا سے شیری تک کا سفر اس کردار کی بے شناختی کا سفر ہے۔ ہر فرد خواہ وہ کسی بھی معاشرے یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو اس کے لیے اس کی شناخت اہم ہے۔ مصنفہ گیانا سے وابستہ افراد کی تنہائی اور اس سے وابستہ یاروں کے باعث ان کو ڈپریشن، ذہنی ناآسودگی، داخلی گھٹن، کش مکش اور ماضی کی یادوں کو بھی خوش اسلوبی سے بیان کرتی ہیں۔

> سامنے دیوار پر دو بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں ٹنگی نظر آتی تھیں۔ اس میں گیانا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ مسز چین تصویر کے پاس کھڑے ہو کر بڑبڑائیں اور ٹھنڈی سانس لی۔ نہ جانے کیوں ان کا دک یک دم اداس ہو گیا اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ کیا ہوا مسز چین؟ ۔۔ رہنے دو، جانے دو انھیں جب گیانا یاد آتا ہے تو شدید ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ چپ چاپ گم صم۔ کھوئی کھوئی، بے چین۔ [۱۸]

انجیلکا کو ایک عیسائی جوڑا گیانا کے جنگل سے اپنی بیٹی بنا کر لے آتے ہیں۔ انجیلکا سے ڈیلا نکہ اور پھر ڈی تک کا سفر اس کی زندگی کی بے شناختی کا سفر ہے۔

جس طرح گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے سانحے کے باعث مسلمان تارکین وطن بے شناخت ہو کر

امریکی معاشرے میں محض دہشت گردی کی مسلط کردہ شناخت ان کے پاس رہ جاتی ہے۔

مصنفہ روایتی رنگ سے کتراتے ہوئے منفرد اور جدید رنگوں میں بسے موضوعات کو اپنی فکری جہتوں میں سموئے ہوئے اپنے مشاہدات و تخیلات کو کرداروں کی بے شناختی سے جوڑتے ہوئے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ جیسے ناول میں گیانا سے منسلک تاریخی واقعی کو حیرت انگیز طور پر دلکش بنا کر پیش کرتی ہیں۔گیانا خوبصورت جزیرہ اور اس میں بسنے والے جم جونز کی طرف سے دکھائے گئے خوبصورت زندگی گزارنے کے خواب اور خواہشات کی تکمیل کی چاہت میں گیانا میں بسنے والوں کے خواب کا چکنا چور ہونا،اور جم جونز کی زیرِ نگرانی مجبور بے بس غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کی بے شناختی کو موضوع بنایا ہے۔مصنفہ اس تاریخی واقعے کو ناول میں اس خوبصورتی سے سموتی ہیں کہ قاری خود کو اس جزیرے کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

اسی طرح ناول میں مصنفہ گیانا ایلیے سے پہلے کرداروں کے حقوق کے استحصال اور غلامانہ زندگی میں بے شناختی اور گیانا سانحے کے بعد بھی کرداروں کی تاحیات بے شناختی کو بیان کرتی ہیں۔ جیسے گیانا سانحے کا متاثرہ کردار ڈی ہمیشہ کشمکش اور الجھن کا شکار ہوتی ہے۔انجیلکا امریکہ میں شیری کی پہچان سے زندگی بسر کرتی ہے وہ بھی اپنی شناخت اپنی اصل نہیں جانتی۔ وہ کوشش کر کے اپنی زندگی کے رازوں کو پالیتی ہے۔ڈی بے شناختی کی بھٹکتی موجوں سے سر ٹھکراتی ہے جب اپنے اصل تک رسائی حاصل کرتی ہیں تب موت آن دبوچتی ہے۔گیانا سے وابستہ کردار بے چین ہمیشہ الجھن کا شکار اور احساس محرومی میں مبتلا ہوتے ہیں۔لاعلمی میں بھی پر اسراریت ہے۔شناخت اور بے شناختی کے سفر میں مصنفہ کرداروں کو سرگرداں دکھاتی ہیں۔مصنفہ کرداروں کی داخلی و خارجی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے الجھن میں مبتلا بے شناخت کرداروں کی خود کلامی کو بیان کرتی ہیں

کیا کوئی بھی میرا نہیں؟

میری زندگی ایک فریب،ایک مفروضہ ہو۔۔

مجھے کچھ کرنا ہو گا اپنے لیے،اپنی زندگی،اپنی حقیقت کے لیے آخر میری زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہئے میری ذات ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔[۱۹]

بے شناختی، تنہائی کا احساس،ذہنی کش مکش عدم تحفظ،مایوسی،بے چینی اور نفسیاتی مسائل کو مصنفہ خوبی سے موضوع بناتی ہیں۔ جیسے کہ ناول میں کردار نفسیاتی مسائل سے دوچار نظر آتی ہے۔ کئی حوالوں سے نفسیات کی پرتیں کو سلیقے سے کھولتی ہیں۔نفسیاتی الجھنوں سے نبرد آزما ہو کر کیفیات کا اظہار کمال فن مہارت سے منظرِ عام پر لاتی ہیں ۔مصنفہ جان دار پلاٹ اور واقعات کے باربط تسلسل سے کرداروں کے سب سے بڑے مسئلے شناختی بحران کو بیان

کرتی ہیں جس کے لیے مصنفہ سادہ انداز اپناتے ہوئے جذبات واحساسات کو فطری انداز میں پیش کرتی ہیں۔

ناول میں مصنفہ نے وہ علامتی انداز بھی اپنایا ہے جس سے بین السطور میں عیاں ہوتی علامتوں کی تہہ میں جھانکیں تو معنی کا جہاں آباد ہوتا ہے۔اسی طرح مصنفہ میجک ازم کے کمالات دکھاتے ہوئے ناول کو نقطہ عروج بخشتی ہیں جہاں پہنچ کے ناول تجسس کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اس ناول کا ہر نسائی کردار مردانہ کردار سے مضبوط اور بہادر ہے اور مردانہ کردار نسائی کرداروں کے مقابلے میں کمزور جلد خوف میں مبتلا ہو جانے والے کردار ہیں۔

شناخت کا مسئلہ افراد میں جنم لیتا ہے تو عروج سے زوال کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔مصنفہ اس زوال پزیری میں کرداروں کو مایوسی اور ناامیدی کے حوالے بے سہارا نہیں چھوڑتی ہیں۔بلکہ انھیں امید کی کرن دکھاتے ہوئے بیدار کرتی ہیں تا کہ وہ اپنے شناختی حوالے تلاش کریں۔

مصنفہ عصری انتشار اور گیارہ ستمبر کے باعث مسلمان تارکین کی زوال پزیر قدروں کو بیان کرتے ہوئے بے شناختی کے اس عمل کو بیان کرتی ہیں جو تارکین کے وجود کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔کوئی بھی معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت،روایات واقدار، نظریات وعقائد سے پہچانا جاتا ہے۔اور جب یہی قدریں چھوڑ دی جاتی ہیں تو وہ ایسے ہی بے شناخت ہو جاتے ہیں جیسے مصنفہ ناول میں بیان کرتی ہیں۔

مصنفہ قاری کے زہن میں کئی سوالات ابھارتی ہیں اور پھر چابک دستی سے کرداروں کو ان کے گرد گھومتے ہوئے اپنی فکری جہتوں کو عیاں کرتی ہیں۔

اسلوب اور تکنیکی جائزہ:

اسلوب فنِ ناول نگاری کا اہم جزو ہے۔ہر تخلیق کار کا اپنا انداز تحریر ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔اسلوب مصنف کی شخصیت اور خیالات کا عکاس ہوتا ہے۔اسلوب تخلیق کار کا وہ طرزِ نگارش ہے جو اسے دوسروں سے منفرد بنا کر شناخت عطا کرتا ہے۔اور اس کے خیالات وافکار کے اظہار کا وسیلہ بنتا ہے۔اسلوب شخصیت کا عکس قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔اسلوب کا مصنف کی انفرادیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔در حقیقت اسلوب یعنی تخلیق کار طرزِ نگارش ہی اسے ددسرے تخلیق کاروں سے الگ پہچان عطا کرتا ہے۔بقول عابد علی عابد

> اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے۔اس کی انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔[20]

اسلوب کی سادگی:

نیلم احمد بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ میں اسلوبِ بیان سادہ اور بہت واضح اختیار کیا ہے جس میں کسی قسم کی بناوٹ اور مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ناول میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے مصنفہ نے سادہ اسلوب اپناتے ہوئے گنجلک باتوں سے اجتناب کیا ہے۔ مصنفہ خود اپنے اسلوب کے بارے میں کہتی ہیں

میرا اسلوب سادہ ہے میں گنجلک باتیں نہیں کرتی، نہ ہی فلسفیانہ بولتی ہوں نہ ہی لکھتی ہوں اختصار اسلوب کی خوبی ہے۔ [۲۱]

مصنفہ کا اسلوب مختصر، سادہ، مگر جامع اور موثر ہے۔ ایسا اسلوب نہیں جو بالکل سپارٹ اور بے کیف ہو بلکہ اس میں ادبی چاشنی موجود ہے۔ مصنفہ کا مشاہدہ تمام تر وسعتوں کے ساتھ قاری پر عیاں ہوتا ہے اور قاری کے لیے دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ مصنفہ کے اسلوب میں بیانیہ انداز نظر آتا ہے۔ جیسے کے ناول میں مصنفہ ناول میں تارکین وطن کی مشکوک شناختوں اور معاشی بحران کے بارے میں لکھتی ہیں

نائن الیون کے بعد امریکا میں بہت سخت معاشی مراجعت کا دور چل رہا تھا۔۔لوگ بے روزگار ہوتے چلے جارہے تھے۔ہندو، مسلم، سکھ، سبھی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا۔ [۲۲]

ناول میں تارکین وطن کے جذبات و احساسات اور گیارہ ستمبر کے بعد کے سانحے کے پیش نظر لفظیات و اسلوب کی سادگی اور صاف گوئی کو اپناتے ہوئے تارکین وطن کے شناختی بحران کو بیان کرتی ہیں۔ مصنفہ کے فن کی یہ خوبی ہے کہ وہ اختصار اور جامعیت سے اپنی فکر کو فنی لوازمات کے زریعے بیان کرتی ہیں۔

مصنفہ زندگی کے ہر پہلو کی سیاسی و تمدنی۔ معاشی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، مذہبی و اخلاقی حوالوں سے اسلوبِ بیان کی رنگارنگ جہتوں سے صفحہِ قرطاس پر رنگ بکھرتی نظر آتی ہیں۔ مصنفہ نے ایسا اسلوب نہیں اپنا کے بار بار لغت دیکھنی پڑے اپنی علمیت کا رعب جھاڑنے کے بجائے سادہ دلچسپ انداز قابل فہم، آسان اور منفرد اسلوب میں باآسانی بات بیان کرنے کا فن جانتی ہے اور ناول میں اس کا باخوبی اظہار کرتی ہیں۔ فصاحت و سلاست بھی مصنفہ کے اسلوب کی اہم خوبی ہے۔ نعیم بیگ نیلم احمد بشیر کے فن سے متعلق لکھتے ہیں کہ

چکاچوند روشنی میں بھی پوری تازگی، بشاشت کے ساتھ لہجے کی سلاست و فصاحت کو لے کر آگے بڑھتی ہے جو بنیادی اور ٹھوس زندہ حقیقتوں کی عکاس بن جاتی ہے۔ [۲۳]

زبان و بیان:

مصنفہ روز مرہ زندگی کی معیاری زبان و بیان اور موقع محل کی مناسبت سے اختیار کرتی ہیں۔ تخیل اور

حقیقت کی آمیزش کو الفاظ کی نشست و برخاست کو عام قاری کی ذہنی سطوں کو مد نظر رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ زبان و بیان کی سادگی سے اسلوب کی تاثر میں اضافہ کرتی ہیں۔ وہ زبان کی بار یکیوں اور پر لطف نزاکتوں کو مد نظر رکھتی ہیں۔ الفاظ کے خوبصورت استعمال سے اسلوب میں جدت پیدا کی ہے۔ زبان و بیان میں سادگی کو ترجیح دی ہے۔

تمہارا کوئی کریمنل ریکارڈ ہے تو میں کمپیوٹر پر چیک کر لوں گی۔۔۔ میں آپ کو بتا دوں، میں پیدائشی امریکن ہوں۔ نیو یارک کے مشہور ہسپتال۔۔۔ میں پیدا ہوا ہوں۔ [۲۴]

تشبیہات و استعارات کا استعمال:

مصنفہ نے ناول میں دیگر مقامات پر تشبیہات و استعارات کا بھر محل استعمال کیا ہے۔ مصنفہ قوت مشاہدہ اور محسوساتی سطح پر تلخ حقائق کو قلمبند کرتے ہوئے کرداروں کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں۔ جملوں میں موسیقیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مصنفہ نے تشبیہ و استعارہ کے استعمال سے اسلوبِ بیان میں نکھار پیدا کیا ہے ناول میں خاص طور پر تشبہات و استعارات کے حوالوں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ماں اور بچے جدائیوں اور ملاپ کے مدار میں بھٹکتے ہوئے ایسے سیارے تھے۔ [۲۵]

شمع کو غصہ آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ [۲۶]

ہماری دنیا کسی لجاتی ہوئی دلہن کی طرح دھیرے دھیرے آگے بڑھتی جا رہی۔ [۲۷]

دریا کے سینے پر تعمیر شدہ پرازانویل استقامت سے کھڑے روشنیوں سے جگمگاتا دکھتا تھا جیسے موتیوں اور جوہرات سے سجا ایک ہار جسے دریا نے محبت سے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ [۲۸]

گوری لڑکیوں کے گہرے کٹاؤ والے گریبانوں سے جھلکتا ان کے جسم کا دودھیا پن چاندنی بکھیرتا بہت بھلا لگتا تھا۔ [۲۹]

بھلا اتنی پیاری سی مینا کی آواز کو نہ پہچانوں گا۔۔ کاغذ ہوا میں یوں اڑ رہے تھے جیسے مرے ہوئے سفید پتنگے ہوں۔ [۳۰]

کتنی باوقار سکیٹنگ کرتی تھی وہ جیسے کسی تالاب کے سینے پر تیرتی ہوئی ایک خوبصورت راج ہنس ہو۔ [۳۱]

پھول کی طرح کھلتی چلی گئی۔ [۳۲]

زمین پر دھری قطار اندر قطار سینکڑوں لاشیں یوں پڑی تھیں جیسے مرے ہوئے کاکروچ ہوں۔ [۳۳]

مراد کا سر گھومنے لگا اور وہ سدھائے ہوئے بندر کی طرح اس کے اشاروں پر رقص کرنے لگا۔[۳۴]

دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال:

مصنفہ زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہوئے دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ مصنفہ دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ دوسری زبانوں کے الفاظ موقع محل کی مناسبت سے فطری طور پر برتے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے مصنفہ نے ناول میں اردو، انگریزی، پنجابی، بنگالی اور ہندی زبان کے الفاظ بہت خوبصورتی سے فطری انداز میں استعمال کیے ہیں۔ تارکین کے جذبات و احساسات اور اندرونی کیفیات و احساسات کو فطری انداز میں پیش کرتی ہیں۔ چند مثالیں

انگریزی :

windows of the world[۳۶]

I love new york, the Big Apple. i want to wake up[۳۶]

in the city that never sleeps new york[۳۷]

its like a pandora Box[۳۸]

Have a good time---its all right[۳۹]

"let s go"[۴۰]

"promethelas, teacher of every art,has brought fire to Earth, that has proven to mortals,a means to a mighty end"[۴۱]

"the last ride together"[۴۲]

"who knows but the worla may end to night."[۴۳]

"let America be America again let it be the dream it used to be "let Ameria be the dream,the dreamer dreamed let it be that great strong land of love"[۴۴]

" love bird."....what the hell"[۴۵]

"All night to get to you"[۴۶]

"God bless Aamerica....from swa to shining sea" [47]

" mind your own business" [48]

پنجابی:

"آگا چیک کیانہ پچھا" [49]

"یارو کیا زبردست کڑی ہے" [50]

ہندی:

"آشیر باد دیا تھا" [51]

"انتی"---سپنا---دھرم-- [52]

بٹیالی (بنگالی):

مادر دیس کا شند راگ امر جب گاتے ہیں تو---اپنے شوندر بنگلہ دیش پہنچ گیا۔ ہماری دنیا کسی دریا پہ تیر رہی ہے۔ ہم ماجھی ہے اور جال سے مچھلیاں پکڑ رہا ہے، ہماری نیا کسی لجاتی ہوئی دلہن کی طرح۔ [53]

تمثیل کا انداز:

مصنفہ نے ناول میں حسن پیدا کرنے کے لیے تمثیل کا نیا انداز اپنایا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں روایتی یا داستانوی تمثیلی انداز نہیں اپنایا بلکہ موقع و محل کی مناسبت سے اپنے عہد کی رائج کردہ زبان و بیان میں تمثیل کا استعمال کرتی ہیں۔ مصنفہ کا اسلوب دستانوی نہیں ہے لیکن شعرانہ انداز کی جھلک نظر آتی ہے۔

پوری دنیا ایک سمندر ہے اور زمین میں بہت سے جزیرے ہیں مگر نیویارک جیسا جزیرہ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے اتنا زندہ اور دھڑکتا ہے جیسے کسی محبوب کا دل ہو۔ [54]

شعرانہ آہنگ:

طاؤس فقط رنگ کے اسلوبِ بیان میں سادگی، روانی اور سلاست کے ساتھ خوبصورت انداز تحریر میں شعرانہ آہنگ کی جھلکیاں ناول میں کئی مقامات پر نظر آتی ہے۔ مصنفہ کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ وہ شعرانہ فضا قائم کرتی ہیں جس سے پڑھتے ہوئے خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے۔ مصنفہ تارکین کرداروں کے جذبات کی شدید نوعیت کا اظہار شعرانہ پیرائیہ بیان میں کرتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

اتنازندہ اور دھڑکتا ہے جیسے کسی محبوب کا دل ہو۔۔۔ یہ وہ شہر ہے جو کبھی سوتا نہیں۔ ہر وقت جاگتا اور دمکتا ہے، تڑپتا اور دھڑکتا ہے۔ [۵۵]

ان تھرکتے، مچلتے لمحوں میں ہی زندگی کا سراغ پنہاں ہے۔ [۵۶]

دو اونچے پربتوں کو دیکھتے ہوئے الاؤنکل چکے تھے۔ [۵۷]

شکست کا احساس اور تمنا کی لاحاصلی کا غم پوری شدت سے انسانوں پر حملہ ور ہو جاتا ہے۔ [۵۸]

تکنیک:

تکنیک اس طریقہ کار کو کہا جاتا ہے جسے اپناتے ہوئے کوئی تخلیق کار اپنے فن کا مخصوص انداز میں اظہار کرتا ہے۔ مصنفہ نیلم احمد بشیر نے اپنے ناول تکنیکوں کے استعمال سے اپنے موضوع کو عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے پلاٹ میں خوبصورتی بھی پیدا ہوتی ہے اور موضوع کی ادائیگی بھی جامع انداز میں ہو جاتی ہے۔

کہانی کی تکنیک مصنفہ نے ناول میں کہانی کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے تارکین کی اندرونی کیفیات اور انھیں شناخت کے حوالے سے درپیش مسائل کو بیان کیا ہے۔

مصنفہ ناول کی کہانی پر مکمل گرفت رکھتے ہوئے اندازِ بیان میں بعض مقامات پر کہانی کا انداز اپناتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی واقعات کے باربط تسلسل کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ اس انداز سے کہانی آگے بڑھتی ہے کہ قاری آگے کیا ہو گا یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ مصنفہ تجسس پیدا کرتی ہیں جس کی وجہ سے پڑھتے ہوئے بوریت کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ناول کے کرداروں کی زبانی کہانی کے بیان کی تکنیک بھی استعمال کرتی ہیں جیسے کی ایک مقام پر مسز چین مراد کو کہانی سناتی ہیں۔

لمبی کہانی ہے۔ پندرہویں صدی میں ہسپانوی، ولندیزی، فرانسیسی، انگریز بہت سی گوری اقوام نے پانی میں گھرے کو بصورت جزیروں کا رخ کرنا شروع کر دیا اور سوچا انھیں اپنی کالونی بنایا جائے ۔۔ اٹھاریوں صدی کا آخری عشرہ تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ بولٹ نامی شخص جرمنی سے امریکا آیا تو اس نے اپنا امریکن ڑریم حاصل کر لیا۔ [۵۹]

شعور کی رو کی تکنیک آسان ترین الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ذہن میں موجود بے ربط خیالات کے بہاؤ کو شعور کی رو کہہ سکتے ہیں۔ اچانک خیالات کا حال سے ماضی اور ماضی سے مستقبل تک کا سفر شعور کی رو ہے جس سے انسانی ذہن میں کسی بے ربط خیالات کی آمد ہوتی ہے اسے شعور کی رو کہا جاتا ہے۔ یہ تکنیک انگریزی ادب سے اردو ادب کا حصہ بنی ہے۔ اور مصنفہ نے اس کو اور کمال مہارت سے ناول میں برتا ہے اور اس کے زریعے سے

تارکین کی بے شناختی کو بیان کیا ہے۔ جس سے ناول میں حسن پیدا ہوا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں اس تکنیک کو میں شعور کی رو تکنیک کو خوبصورتی بر جستگی سے استعمال کیا ہے۔ ناول کے منتخب کردہ اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔

یوں جیسے ذہن نے کوئی بند زر وازہ کھول دیا ہو۔۔۔ بستر پر لیٹے لیٹے انھیں سب یاد آنے لگا۔ ستر کا عشرہ امریکا کے لیے بہت سی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ ہر قسم کی شخصی، سیاسی۔ جنسی، ہم جنسی آزادے کے نعرے لگ رہے تھے۔ [۱۰]

خود کلامی کی تکنیک مصنفہ شعور کی رو کے ساتھ ساتھ خود کلامی کی تکنیک استعمال میں لاتے ہوئے کرداروں کی اندرونی داخلی و خارجی کیفیات، خیالات و جذبات جو وہ اپنی ذات سے متعلق رکھتا ہے اور الجھن کا شکار ہے لیکن ان احساسات کو کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا مصنفہ ان کیفیات کو کرداروں کی خود کلامی کے ذریعے بیان کرواتی ہیں۔ جیسے کے ناول کا مرکزی کردار مراد الجھن اور بے چینی کا شکار ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ ڈی کو کہ اس ناول کا اہم نسائی کردار ہے اس کا رویہ نہیں سمجھ پاتا وہ اس سے کیا چاہتی ہے اور اب اس کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے جب کسی سے نہیں کہہ پاتا تو خود کلامی کرتا ہے۔

آخر ڈی مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ ۔۔ میں نے اتنی بار اس پر واضح کیا ہے کہ میں اس سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ میں شیری سے مخلص رہنا چاہتا ہوں مگر یہ ڈھیٹ ہڈی ہے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔۔۔ یہ امریکہ بھی کیا ملک ہے۔ کسی کو چین یا قرار نہیں سب کچھ ہونے کے باوجود یہاں لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔ [۱۱]

آپ بیتی کی تکنیک:

مصنفہ نے تارکین وطن کی بے شناختی کو بیان کرنے کے لیے آپ بیتی کی تکنیک کو اپناتے ہوئے کرداروں کے حالات و واقعات، جذبات و احساسات اور کیفیات کو بیان کرتی ہیں بعض مقامات پر کچھ مصنفہ کرداروں کی کیفیات کو ان کی زبانی آپ بیتی کو بیان کرتی ہیں۔ خوف، دہشت گردی اور وجود کی بے شناختی اور ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں۔ ناول میں سے کچھ مثالوں کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں کیسے ایک کردار دوسرے کردار کے سامنے خود پر بیتے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے۔ جیسے کہ شمع اپنی زندگی کی آپ بیتی سجیلہ کے سامنے بیان کرتی ہیں اور اس سے ہمدردی حاصل کرتی ہے۔

ایک بار میں اپنے گھر کے حالات سے تنگ آ گئی۔۔ بھاگ کر شیلٹر ہوم میں داخل ہو گئی وہاں مجھے شدید ڈپریشن ہوا پھر میں نے اپنی کلائی کاٹ لی مگر سٹاف نے بچا لیا"۔۔"نام یہاں کچھ قیدیوں نے مجھے دہشت گرد پکار کر چھیڑا۔۔ آتے جاتے مجھے مسلم ٹیررسٹ کہہ کر تھپڑ جڑ دیتے۔[۶۲]

کہانی اور پلاٹ ناول میں کہانی اور پلاٹ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس کے بغیر کوئی فن پارہ ناول نہیں کہلا سکتا ہے۔ دراصل ایک خاکہ ہوتا ہے جو کہانی کو پیش کرنے کے لیے تخلیق کار کے ذہن میں بنتا ہے۔ اس میں واقعات کی ترتیب و تسلسل بہت۔ ایک اچھے اور کامیاب ناول کا پلاٹ مضبوط ہوتا ہے۔ ایسے ہی نیلم احمد بشیر کے ناول طاوس فقط رنگ کا پلاٹ بہت اہم ہے۔ مضبوط اور اہم ہے۔

تجسس پلاٹ کی وہ خوبی ہے اس ناول کے شروع سے اختتام تک قاری محور رہتا ہے۔ جس سے ناول کے پہلے صفحے کے مطالعے سے آخر تک تجسس بر قرار رہتا ہے اور آگے ناول میں کیا ہونے والے ہے اس کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ ناول کا پلاٹ سادہ ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنفہ گیارہ ستمبر کے سانحے کے باعث تارکین وطن کی بے شناختی کو بیان کرتی ہیں۔ پلاٹ کا دوسرا حصہ گیانا المیے کے باعث کرداروں کے شناختی بحران پر مشتمل ہے۔ پلاٹ کی سادگی، تخیل کی گہرائی اور معنوی وسعت کا جہاں آباد ہے۔

طاؤس فقط رنگ کا پلاٹ مربوط ہے۔ اس کا قصہ پن اور واقعہ نگاری بہت جامع ہے۔ نیلم احمد بشیر نے اپنی پوری فنی چابک دستی سے امریکی پاکستانیوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں ان کے خارجی و داخلی حالات۔۔ سیاسی اور تہذیبی زندگی۔۔۔ نظریات اوران کے عملی تجربات غرض یہ کہ اس طاؤس کہ سہ رنگوں کو کچھ یوں پیش کیا ہے کہ کہانی ختم کرنے کے بعد ہماری نظر ایک بار پھر ناول کے ٹائٹل کور پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔[۶۳]

مصنفہ نے ناول میں دو پلاٹ ترتیب دیتے ہوئے گیارہ ستمبر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور مسلمان تارکین کی زندگیوں کا المیہ بے شناختی اور دوسرا پلاٹ گیانا ٹریجڈی جو کہ المیہ ہے اسے بیان کرتی ہیں۔

مکالماتی تکنیک مصنفہ نے ناول میں نہایت ہنر مندی سے کہانی کے پلاٹ کو مکالموں کے زریعے مضبوط اور مربوط بنایا ہے۔ مصنفہ نے کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کے مابین مکالماتی تکنیک کو بھی اپناتے ہوئے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مکالماتی تکنیک کو خوبصورتی سے برتا ہے کہ کئی کوئی جھول یا خلا محسوس نہیں ہوتا۔ ناول میں سے چند مکالماتی تکنیک کی مثالیں پیش خدمت ہیں۔

تمہاری کوئی فرینڈ ڈیلا نکہ ٹامسن؟

ہاں ہے' مراد نے مختصر جواب دیا

اس نے ہمارے آفس میں اپلائی کیا ہے۔ [۶۴]

یہ کیا ہے ڈی؟ تم نے کیا کر دیا؟۔۔۔موڈ دیکھو تم چھوٹے بالوں میں کتنے کیوٹ لگتے ہو کہاں ہیں

میرے بال؟ تمہارے بال مجھے کیا پتہ کہاں ہیں۔ [۶۵]

کرداروں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے کہانی میں اتار چڑھاؤ سے نیا رخ عطا کرتی ہیں۔ ناول کی کامیابی کا تعلق مکالمے کی موزوینت اور برجستگی سے بھی ہوتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے مکالمے ان کے طبقے اور ان کے معاشرے کے مطابق پیش کیے ہیں جس میں کسی مقام پر جھول نظر نہیں آتا۔

منظر نگاری کرداروں کے مکالمے، واقعات کے ساتھ ناول میں جہاں واقعات کی پیش کش ہوتی ہیں اس ماحول کو دکھانا یعنی منظر کشی ناول کا حصہ ہے۔ مصنفہ نے ناول میں منظر کشی اس طرح کی ہے کہ جس سے وہ ماحول قاری کو اپنی نظروں کے سامنے معلوم ہوتا ہے۔ مصنفہ منظر نگاری میں حقیقت اور تخیل دونوں کی آمیزش سے حال سے ماضی اور ماضی سے حال تک کے سفر کو بیان کرتی ہیں۔ گیانے کے خوبصورت جزیروں اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی و بربادی کے مناظر اور بدلتی صورتحال کو نقش کرتی ہیں۔ منظر کشی کا مطلب محض قاری کو مناظر کا دیدار کروانا نہیں ہے بلکہ کرداروں کے جذبات واحساسات نظریات، عقائد اور اس ماحول کی ترجمانی کرنا ہے۔ مصنفہ جب ورلڈ ٹریڈ سنڑ کی تباہی کے مناظر پیش کرتی ہیں تو قاری پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے وہ بھی ورلڈ ٹریڈ سنڑ میں جلتی آگ کے شعلوں کی تپش محسوس ہو۔

اسفند نے آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔۔چاروں طرف آگ کے شعلے، دھماکوں کی آوازیں، دھوئیں کے سیاہ بادل، انسانوں کی چیخ وپکار اور جلتے ہوئے جسموں کی چمڑی کی بساند تھی۔ [۶۶]

اگست کی ایک خوبصورت صبح مناظر فطرت کی منظر کشی مصنفہ یوں کرتی ہیں۔

نیلم احمد بشیر نے ناول میں۔۔تصویر کشی بڑے شاندار انداز میں کی ہے۔۔۔گویا قاری کی نگاہوں کے سامنے کے سامنے نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی ہیں۔ [۶۷]

مصنفہ کا یہ ناول ۴۹ ابواب پر مشتمل ہے جس میں مصنفہ نے نہ صرف تسلسل اور ربط کا خیال رکھا ہے بلکہ ماحول کی منظر کشی بھی ضرورت کے مطابق کی ہے۔ وہ ماحول کردار اور اس کا اپنے ماحول کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہیں جس سے نہ صرف اس ماحول سے متعلق آشنائی ہو جاتی ہے بلکہ وہ تمام حالات بھی عیاں ہوتے ہیں جن کے باعث

کردار شناختی بحران کا شکار ہوتے ہیں اور کس کس صورت میں وہ مسائل سے دوچار ہوتے اور زندگی کے نشیب و فراز میں اپنے وجود کے تحفظ کے لیے پریشان حال نظر آتے ہیں۔

بے شناختی کے حوالے سے اسلوبیاتی رنگ:

انسان نے چشم بصیرت کے حصول سے ہی اپنی شناخت چاہی ہے۔ جو محض جسمانی نہیں بلکہ معاشرے میں بھی اس کی پہچان بنے۔ جب بھی کوئی فرد عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں جب وہ خود کو محفوظ نہیں پاتا تو اپنی شناخت سے متعلق خود اس کے ذہن میں بھی بے شمار سوالات جنم لیتے ہیں۔

خاص طور پر جب وہ شخص اپنے ملک سے ہجرت کر کے آیا ہو اور اس ملک میں اسے اپنایا نہ جائے تو اکثر وہ شناختی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں کہ وہ کس راستے پر چلے ایسے ہی مصنفہ ناول میں تارکین اور ان کی بے شناختی کو بیان کرتی ہیں وہ اپنا ملک ہر رشتہ چھوڑ کر امریکی سرزمین کو اپناتے ہیں لیکن گیارہ ستمبر کے بعد کی بدلتی صورتحال میں انھیں اس معاشرے میں سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مصنفہ کرداروں کی زندگی میں جبر، داخلی و خارجی حقائق خوف، کرداروں کی اندرونی و بیرونی ٹوٹ پھوٹ کے حوالوں اور ان کے اثرات، کرداروں کی شناخت کی گم شدگی کو نئے اسلوب میں بیان کرتی ہیں۔ مصنفہ کرداروں کی ذاتی شناخت کا سفر طے کرتے ہوئے سیاسی، سماجی اور طبقاتی و نسلی شناخت کو بیان کرتی ہیں۔

مختصر طور پر دیکھا جائے تو مصنفہ امریکی سرزمین پر دو بڑے المیوں کو موضوع بناتی ہیں جو دونوں شدت پسندی کے نتائج کی صورت میں ناول کا حصہ بنتے ہیں۔ اور تارکین شناختی بحران کا سامنا کرتے ہیں۔ ایک معاشرے میں مختلف تہذیبوں کے درمیان پیدا کردہ تضادات کرداروں کو اس سوال کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔ ان کی شناخت کیا ہے۔ خاص طور پر کرداروں کو مذہبی تعصب کی بنیاد پر نہ صرف شناختی بلکہ معاشی بحران کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جسے مصنفہ فنی خوش اسلوبی سے ناول میں بیان کرتی ہیں۔ جس کی مثال ہمیں ناول کے مرکزی کردار کی صورت میں نظر آتی ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگاری سے تنگ آکر ایک گھر میں معمولی سی نوکری اختیار کرتا ہے یہاں مصنفہ امریکی معاشرے میں مذہبی شدت پسندی کو بیان کرتی ہیں۔ مراد کو مسلمان اور پاکستان سے تعلق کے باعث بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مذہب کے باعث مسلمان تارکین تعصب اور تنقید کا نشانہ بنتے ہیں انھیں دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ ناول کے کردار آزادانہ کسی جگہ بھی اپنے مسلمان ہونے کا مظاہرہ نہیں کرتے اپنا لباس پہنتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں

۔اس طرح کرداروں میں دوغلا پن پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کشتیوں کے مسافر خوف سے کانپتے ڈوبتے ابھرتے اور اسی کشمکش میں زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ امریکہ میں پیدا ہونے کے باوجود اس کی شناخت امریکن کے بجائے پاکستان سے جوڑ دی جاتی ہے۔ نہ مراد بلکہ ہر کردار کسی نہ کسی صورت اور کسی سطح پر شناخت کے مسئلے سے دوچار ہے۔

دوسری طرف مصنفہ اس المیے کو زیرِ بحث لاتی ہیں جو امریکی تاریخ کا سیاہ دن ہے جو کے مذہبی شدت پسند جم جونز نامی عیسائی کی وجہ سے ہوتا۔ امن وسکون اور مصنوعی جنت کے نشے میں معصوم انسانوں پر ظلم ان کے حقوق کا استحصال اور بے شناختی بلآخر موت کے منہ میں سلا دیا ہے۔ اور زندہ بچ جانے والے تاحیات اس کے سحر سے نہیں نکل پاتے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ شناخت کا تعلق افراد کے داخلی وخارجی دونوں رجحانات سے ہوتا ہے۔ جب افراد کے اندر احساسِ محرمی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے ان کی شناخت متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔ بے یقینی اور بے اعتباری کی فضا میں سانس لیتے کردار قول وفعل کے تضاد اور داخلی وخارجی کشمکش میں مبتلا بھٹکتے ہیں۔

مصنفہ کی فکری وفنی پختگی کا یہ ثبوت ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم اسلوبِ بیان رکھتے ہوئے بھی نت نئی تکنیکیں استعمال میں لاتی ہیں جیسے کہ مصنفہ نے ناول میں گیارہ ستمبر کے سانحے اور گیانا کے المیے کے باعث کرداروں کے شناختی مسائل کے بیان کے لیے کئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ یوں تو مصنفہ ناول کا آغاز گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے اور اس کی تباہ کارویوں سے کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے گیانا المیے کی صورت میں افراد کی بے شناختی اور افراد کی اموات کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔ تارکین کی بے شناختی کے بیان کے لیے شعور کی رو، اب بیتی کی تکنیک، کہانی کی تکنیک، خود کلامی، مکالماتی تکنیک اور علامتی اور شعرانہ انداز اپناتی ہیں۔

تارکین کی بے شناختی، عدم تحفظ کا احساس، فرد کی تنہائی، ذہنی کش مکش، مایوسی، بے چینی، بے یقینی کی کیفیت اور نفسیاتی مسائل کو مصنفہ خوبی سے موضوع بناتی ہیں۔ قوت مشاہدہ اور محسوساتی سطح پر تلخ حقائق کو قلمبند کرتے ہوئے تارکین کی بے شناختی اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں جہاں وہ امریکہ کی سرزمین پر غیر کی حیثیت سے امریکن کی شکوک وشبہات والی نظروں کا سامنا کرتے ہیں۔ تارکین اور ان کی اولادیں جنھوں نے امریکی سرزمین پر جنم لیا اسی سے محبت کی اسی کے نغمے گائے وہ بھی پاکستانی اور مسلمان ہونے کی وجہ سے شناخت چھین کر دہشت گردوں کی صف میں کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ جہاں وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور بے شناختی ان پر غالب آجاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ www. rekhta .org

۲۔ https: // www .humsub .com .pk

۳۔ https: // www .humsub .com .pk

۴۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۶۔

۵۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۶۔ ڈاکٹر عادل حسین، الحمراء (تبصرے چند)، (لاہور: جون ۲۰۰۹ء)، ص ۱۱۲۔

۷۔ https: // www .humsub .com .pk

۸۔ مسز ثناء رشید، ماہنامہ الحمرا (لاہور: ہاشم اینڈ حماد پرنٹرز، مارچ ۲۰۱۸ء)، ص ۱۹۔

۹۔ نیلم احمد بشیر، طاؤس فقط رنگ، ص ۵۱۔۵۲۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔

۱۱۔ www.facebook.com ,Munir Ahmad Firdows

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۴۔۵۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۲۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۲۰۔ عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۴۲۔

۲۱۔ راقمہ کا نیلم احمد بشیر سے براہِ راست انٹرویو۔ لوک ورثہ (اسلام آباد: ۱۷ فروری ۲۰۱۹ء)۔ دوپہر ۱:۳۵۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۲۳۔ https://www.aikrozab.com

۲۴۔ نیلم احمد بشیر، ص ۵۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۴۳۔ ایضاً۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۴۵۔ نیلم احمد بشیر،طاؤس فقط رنگ(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)، ص ۱۱۲، ۱۳۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۷، ۱۴۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۸۹، ۱۴۱۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۷۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۷۔۸۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۶۳، ۲۵۱۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۸۸۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۱۔۱۴۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۶۳۔ https:// www.humsub.com.pk

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۶۷۔ ثناء رشید العمر، ص ۲۱۔

ماحصل

مجموعی جائزہ

گیارہ ستمبر کے حوالے سے بہت سا ادب تخلیق ہوا ہے اور اس واقعے کے اثرات نہ صرف امریکہ کے تخلیق کردہ ادب پر مرتب ہوئے ہیں بلکہ پاکستانی ادب بھی اس سے متاثر ہوا ہے اور اس کی جھلک اردو افسانوی اور غیر افسانوی ادب دونوں نظر آتی ہے۔ گیارہ ستمبر کا سانحہ امریکی سرزمین کا ایسا سانحہ ہے جس نے نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گیارہ ستمبر کا دن امریکہ کی تاریخ کا اہم دن ہے جس نے دنیا کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک میں بسنے والے مسلمان تارکین وطن کی شناخت چھین لی۔ نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر جس کا شمار دنیا کی بلند ابالا عمارت میں ہوتا ہے فضائی حملوں کے باعث فلک بوس ہو گئی۔ اس حملے کا ذمہ دار اسامہ بن لادن کو قرار دیا گیا جس کے باعث تمام مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جانے لگا بلخصوص وہ مسلمان جو امریکہ میں قیام پزیر تھے وہ بے شناخت ہو گئے ان کی شناخت ان کی حیثیت امریکیوں کے شکوک وشبہات کی نظر ہو گئی۔

تارکین وطن کی امریکہ میں جمی جمائی زندگیوں کی بساط الٹ گئی ۔ان کے اور امریکیوں کے درمیان اجنبیت اور سرد مہری کی دیوار حائل ہو گئی۔ انسان کوئی ساکن اور جامد شے نہیں ہے جو ایک ہی جگہ پر مستقل موجود رہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان وقت وحالات کے تقاضوں کے تحت اپنا وطن ترک کر کے دوسرے ممالک میں بھی قیام پزیر ہوتا ہے یہ ترک وطنی جبری و خود اختیار کردہ دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے۔ ترک وطنی محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی بھی ہوتی ہے جو انسان کو ماضی کی یاد اور مستقبل کے خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔ ترک وطنی کا احساس آدم علیہ السلام کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا۔

انسان نے وقت وحالات کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کیے ہیں اور ان مراحل کو طے کرتے ہوئے بعض اوقات اسے اپنا وطن ترک کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ دوسرے معاشرے اور ملک میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اور جب اسے وہاں کا شہری تسلیم نہ کرتے ہوئے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ شناختی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ترک وطن کر کے آنے والوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ "شناخت" کا پیدا ہوتا ہے۔ اپنا ملک اپنا سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو اپنایا نہیں جاتا۔ ترک وطنی انھیں ایک بار پھر بے شناخت کر دیتی ہے۔ ایسے ہی تارکین وطن جو پاکستان سے امریکہ اپنا وطن ترک کر کے جاتے ہیں ان کی اولادیں وہی جنم لیتی ہیں اسی فضا میں سانس لیتی اور پرورش پاتی ہیں

گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے بعد وہ اپنے ہی گھروں میں جلاوطنی کے احساس سے دوچار ہوتے ہیں اور شناختی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔

مشرقی و مغربی تہذیبوں کے تصادم اور مذہبی انتہاپسندی نے گیارہ ستمبر کے بعد تارکین وطن کی شناخت اور ساخت دونوں کو شدید متاثر کیا۔ امریکا نے گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان تارکین کے لیے غیر اور دہشت گردی اصطلاح استعمال کی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان تارکین عدم تحفظ کا شکار ہو گئے اضطراب و انتشار کی صورت حال سے مسلمان تارکین کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا ہوا۔

ترک وطن کر کے امریکہ میں بسنے والی مختلف اقوام گیارہ ستمبر کے بعد شناختی بحران کا شکار ہوئیں لیکن مسلمانوں کو سب سے زیادہ شناختی، تہذیبی و ثقافتی، نفسیاتی، معاشی و معاشرتی بحران کا سامنا کرنا پڑا اور دہشت گردی کا طوق ان کے گلے میں لٹکا دیا گیا۔ جب کوئی مسئلہ کسی معاشرے میں جنم لیتا ہے اس معاشرے کا احساس طبقہ اسے محسوس کرتے ہوئے مختلف اصناف سخن میں موضوع بناتا ہے۔ نیلم احمد بشیر اس سانحے کی عینی شاہد ہیں اس لیے اس سانحے اور اس کے پیشِ نظر تارکین وطن کے مسائل بالخصوص شناختی بحران کو جاننے کے لیے مصنفہ کے ناول طاؤس فقط رنگ کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مقالے کی بنیاد درجہ ذیل سوالات پر رکھی گئی ہے۔

ا۔ نیلم احمد بشیر کے ناول "طاؤس فقط رنگ" میں تہذیبی ٹکراؤ کے نتیجے میں شناختی بحران کیسے جنم لیتا ہے؟

۲۔ ناول میں کرداروں کے زریعے عدم شناخت کا مسلۂ کیسے پیش کیا گیا ہے؟

۳۔ نائن الیون کے نتیجے میں فکری، سیاسی و سماجی اور تہذیبی سطح پر رونماں ہونے والی تبدیلیوں سے مسلمان امریکیوں کی زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

ان سوالات کو بنیاد بناتے ہوئے مقالہ تحریر کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان سوالات کے جوابات تلاش کیے جائیں۔ گیارہ ستمبر کے پس منظر میں اور گیانا ٹریجڈی جسے ۱۹۷۸ء کا نائن الیون کہا جاتا ہے ان دونوں المیوں کے باعث امریکی سرزمین پر تارکین اور خاص طور پر مسلمان تارکین کے شناختی بحران کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں نیلم احمد بشیر کے ناول میں پیش کردہ کہانی ظاہری نظریات سے پوشیدہ حقائق کے مطالعے کے زریعے موضوعی مقالے کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے یہ دیکھا گیا ہے کہ مصنفہ نے کس طرح ناول میں کرداروں کے

زریعے اپنی عناصرِ زندگی میں تارکین کو درپیش شناختی مسائل کو پیش کیا ہے۔

تحقیقی مقالے کے سوالات اور ابواب بندی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نیلم احمد بشیر کے ناول طاؤس فقط رنگ میں تارکین کی بے شناختی اور فکری و فنی محاسن کا جائزہ لیا ہے اس سلسلے میں سانحہ گیارہ ستمبر کی عینی شاہد مصنفہ کی رپوتاژ "ستمگر ستمبر" کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں نہ صرف گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد تارکین کے شناختی مسائل، انھیں دہشت گرد اور غیر کی اصطلاح کے المیے کو بیان کیا بلکہ ساتھ ہی گیانا کے المیے اور اس کے باعث کرداروں کی بے شناختی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو ناول میں سمویا ہے۔ مصنفہ نے اپنے ذاتی تجربات و احساسات، خیالات اور مشاہدات کو کہانی کی صورت میں واقعات کے تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول چونکہ افسانوی ادب کا حصہ ہے یہ غیر افسانوی نثر کی طرح سو فیصد حقائق پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس میں تخلیق کار واقعات کی حقیقت اور تخیل کی آمیزش بھی شامل کرتا ہے۔ مصنفہ نے امریکی معاشرے میں زندگی کے شب و روز بسر کیے ہیں۔ اس معاشرے کو دیکھا، پرکھا اور اس کے نشیب فراز کو محسوس کیا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں معاشروں میں زندگی بسر کی اور دونوں معاشروں کے تہذیبی تصادم اور اس کے باعث پیدا کردہ کرداروں میں شناختی بحران کو بیان کیا ہے۔

شناخت کا تعلق کسی فرد کی اس پہچان سے ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ شناخت کا تعلق فرد کے مربوط نظامِ حیات سے وابستہ ہے جہاں اس کی شناخت کی مختلف سطحیں ہیں۔ شناخت فرد کی ذات، کئیں مذاہب، خطے، رنگ و نسل، لباس، جغرافیہ، وغیرہ سے منسلک کرتے ہیں۔ جب فرد اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ وہ کون ہے اس کی اس معاشرے میں کیا حیثیت ہے اپنی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار اور تاریخ سے جڑا ہوتا ہے معاشرے میں اس کا کردار کیسا ہے اور کیسا ہونا چاہیئے یہ اس کی شناخت ہے۔ اور جب کوئی فرد ان باتوں کے بارے میں کشمکش کا شکار ہو وہ کون ہے؟ وہ شناختی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور خاص طور پر جب مسلمان اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ جا بسے اور اس سرزمین پر گیارہ ستمبر کا سانحہ وقوع پزیر ہوا تو مسلمان تارکین کو ایسی ہی صورت حال پیش آئی۔ مصنفہ نے اس صورت حال کر کرداروں کی مدد سے پیش کیا ہے۔

مصنفہ ناول کی مختصر کہانی کے زریعے تارکین کی زندگیوں کی پیچیدگیوں کی وضاحت کرتی ہیں جو گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی نژاد کو پیش آتی ہیں۔ کیوں کہ گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد مسلمانوں سے نفرت اور مخالفت نے شدید زور پکڑ لیا اور پاکستانی تارکین کو دہشت گرد کی صف میں لا کھڑا کر دیا گیا۔ یوں تو ناول کے تمام تارکین کردار

اس مشکل کو سہتے ہیں لیکن مصنفہ ناول کے ہیرو کے زریعے سے اس صورت حال کی باخوبی عکاسی کی ہے جسے بنا کسی جرم کے ایک شکایت اور شک کی بنیاد پر قید خانے میں رہنا پڑتا ہے۔عدالتوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور دہشت گردی کا الزام سہتے ہوئے انتہائی بے بسی اور بے یقینی کی کیفیت کی مبتلا کمزور ممالک کی علامت کے طور پر نظر آتا ہے۔

مصنفہ نے امریکی معاشرے کی متضاد ساخت اور طرزِ عمل کو پیش کیا ہے کہ کس طرح امریکہ نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتاہوا پاکستانی تارکین کی شناخت کو داغ دار کرتے ہوئے بے شناختت کر دیتا ہے۔مصنفہ نے اس سطح پر امریکی نسل پرستی اور تعصب آمیز رویوں کو ظاہر کیا ہے۔

طاؤس فقط رنگ پر جوش مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے تارکین کی شکست وریخت اور بے شناختی کی داستان ہے۔گیارہ ستمبر کے بعد تارکین اور ان کی اولادوں کے اعتماد کو شدید دھچکا لگا۔جب انھیں اس صوت حال کا سامنا کرنا پڑاامریکن انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے دہشت گرد کہتے ہیں۔یہ جان کر کہ انھیں امریکی نہیں سمجھا جاتا ان کی حیثیت غیر کی ہے وہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا شناخت کے مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں۔طاؤس فقط رنگ جیسے کے عنوان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ ایک مور کی طرح ہے۔جس کے بہت سارے رنگ ہیں۔

شناخت کا مسئلہ بے یقینی اور الجھن کا وہ دورانیہ ہے جہاں کردار اپنی شناخت کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ناول میں مصنفہ نے کرداروں کے زریعے شناختی بحران کو بیان کیا ہے۔ایک سے زائد تہذیبوں کے تصادم اور سیاسی وسماجی اقدار،روایات، نظریات و عقائد کے فرق، مشرق واور مغرب کے تصادم،رنگ و نسل کے امتیازات وغیرہ سے تارکین کا شناختی منظر نامہ تشکیل دیا ہے۔یہاں ہر کردار شناختی بحران کا شکار اور غیر محفوظ نظر آتا ہے۔اردو ناولوں کی روایت کے برعکس ناول کے مردانہ کرداروں کے بجائے نسائی کردار زیادہ مضبوط اور مستحکم ہیں۔تمام کردار اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ناول کا مرکزی کردار مراد غیر مستقل مزاج ہے جس کی شخصیت بکھری ہوئے ذہنی انتشار کا شکار ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی کا ساتھ چاہتا ہے وہ اکیلا نہیں رہ سکتا دوسروں کے سہاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔مراد پر دہشت گردی کے الزام کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔یہ کردار نسائی کرداروں کی نسبت کمزور کردار ہے وہ مسلمان تارکین وطن اور ان کی اولادوں کی بے بسی اور بے شناختی کی عکاسی کرتا ہے۔

ایسے ہی نسائی کرداروں میں پورے ناول پر چھایا ہوا کردار ڈی کا ہے جو مضبوط بے خوف و خطر ہر صورت حال کا سامنا کرنے والی جادوئی طاقت کی حامل ہے لیکن یہ کردار بھی شناختی بحران میں مبتلا ہے لیکن اس کی نوعیت دوسرے کرداروں سے مختلف ہے۔ سجیلہ ایسا کردار ہے جو ترک وطن پرست ناسٹلجیا کا شکار ہے۔ ہر کردار روانی سے شروع کے ساتھ چلتا ہے۔ کنول، سجیلہ، شیری، ایسے نے شناخت کردار ہیں جو حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ مسٹر چین اور مسز چین بے بس، بے شناخت ناسٹلجیا کا شکار ہیں۔ تمام کردار اپنی جگہ اہم ہیں لیکن سب کرداروں پر ڈی کا کردار حاوی ہے۔ مصنفہ کی کردار نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کردار حقیقی دنیا کے چلتے پھرتے افراد معلوم ہوتے ہیں۔

مصنفہ نے امریکی معاشرے میں مذہبی بنیادوں پر تعصبات کو محسوس کرتے ہوئے کرداروں کی سیاسی و مذہبی طور پر پیدا کردہ کرب انگیزی کو بیان کیا ہے۔ ترک وطنی کے احساس تلے دبے کرداروں کی بے یقینی کی کیفیت اور شناخت کے مہندم ہو جانے کا دکھ اور ناسٹلجیا کا احساس شدت سے پیدا ہوا ہے۔ تارکین محض زمین کی دوری کا غم نہیں برداشت کرتے بلکہ پوری تہذیب و معاشرت، روایات و اقدار سے کٹ جاتا ہے۔ بے شناختی کی زندگی اذیت ناک ہے جہاں کردار بے یقینی، بے زمینی، عدم تحفظ اور عدم تشخص کا شکار ہو کر احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

گیارہ ستمبر کے سانحے کے باعث مصنفہ نے ناول میں بے شناختی کا کرب، شناخت اور سکون کی تلاش، سیاسی و سماجی مسائل، لاتعلقی اور اجنبیت کی فضا سے کرداروں کو انفرادی و اجتماعی طور پر متاثر کیا ہے۔ گیارہ ستمبر اور گیانا المیے کے باعث ہولناک انسانی المیے، سیاسی، معاشی، تہذیبی، نفسیاتی اور شناختی بحران کو رقم کیا ہے۔ جب کردار زندگی کے سفر میں شناخت سے محروم ہوتے ہیں تو ان کی ذات زروں کی صورت میں بکھرنے لگتی ہے۔ شناخت کی گمشدگی کا شکار بحران در بحران میں بسر کرنے والے اسی کیفیت میں کچھ کردار ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے سجیلہ، اسفند، مسٹر چین اور مسز چین شامل ہیں۔ مصنفہ چابک دستی سے ماہر نفسیات بن کر کرداورں کہ نفسیاتی الجھنوں کو بھی بیان کرتی نظر آتی ہیں۔

گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان تارکین کو امریکہ کی جانب سے دہشت گرد کہنا ان کی شناخت کا سوال اور پھر بحران کا جنم لینا اور پوری قوم کا اس شناختی بحران کی زد میں آنے کی صورت میں مصنفہ کرداروں کے زریعے سوالات قارئین کے سامنے رکھتی ہیں۔ وہ اپنی جڑوں، منزل اور شناخت سے متعلق سوال اٹھاتے ہیں وہ دہشت گردی کی اصطلاح سے بچنا چاہتے ہیں وہ جبری عطا کردہ دہشت گردی کی شناخت کے باعث احساس محرمی، بے چہرگی اور رفتہ رفتہ

ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتے ہیں۔

مصنفہ نے دورِ جدید کے سب سے اہم مسئلے اور ٹیکنالوجی کے غلط استعمال یعنی سائبر کرائم کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس کے غلط استعمال سے جیسے کی 'ڈی' دوسروں کی زندگیاں برباد کرتی ہے۔ مصنفہ نے امریکی سرزمین میں دو بڑے المیوں اور شدت پسندی کے نتائج کو بیان کیا ہے جو تارکین کو بھگتنے بڑتے ہیں۔ امریکی سرزمین میں مختلف تہذیبوں کو سامنے لاتے ہوئے ان کے مابین پیدا کردہ تصادات خاص طور پر کرداروں کو مذہبی تعصب کی بنیاد پر نہ صرف شناختی بحران بلکہ معاشی بحران کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے جسے مصنفہ نے فنی خوش اسلوبی اور زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنفہ نے سادہ عام فہم اور واضح اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے جس میں کسی قسم کی بناوٹ، مصنوعی پن یا فلسفیانہ رنگ نہیں جھلکتا۔ مصنفہ نے الجھانے والی باتوں سے اجتناب برتتے ہوئے اپنے مشاہدات و احساسات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنفہ کے اسوب کی بڑی خوبی ہے کہ وہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔

فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو مصنفہ نے تارکین کے جذبات و احساسات اور گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد لفظیات و اسلوب کی سادگی کے ساتھ کرداروں کے شناختی مسائل کو رقم کرتی ہیں۔ اپنی فکر کے اظہار کے لیے تشبیہات واستعارات، علامات، دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال، تمثیل کا انداز، شعرانہ آہنگ، کہانی کی تکنیک، شعور کی رو کی تکنیک، خود کلامی کی تکنیک، مکالماتی تکنیک، آپ بیتی کی تکنیک کو خوش اسلوبی سے برتا ہے۔

طاؤس فقط رنگ کا پلاٹ مضبوط اور باربط ہے۔ پلاٹ کی پرکشش ترتیب سے ناول کے شروع سے اختتام تک قاری محو رہتا ہے۔ پلاٹ سادہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنفہ گیارہ ستمبر کے سانحے کے باعث تارکین وطن کی بے شناختی کو بیان کرتی ہیں اور فلیش بیک میں پلاٹ کا دوسرا حصہ گیانا المیے کے باعث کردارروں کے شناختی بحران پر مشتمل ہے۔ یہ دن گیانا کی تاریخ کا سیاہ دن اور بدنماں داغ ہے جس میں بہت ساری جانیں جم جونز کی انتہا پسندی کی نظر ہو جاتی ہیں۔ پلاٹ کی سادگی، تخیل کی گہرائی اور معنوی وسعت کا جہاں آباد ہے۔ مصنفہ نے گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد کرداروں کو درپیش مسائل اجنبیت اور بیگانگی کی فضا، امریکیوں کی سرد مہری، تعصب اور شکوک و شبہات کی نگاہ سے انھیں دیکھا جانا اور اس سانحے کے مسلمان تارکین کی زندگیوں پر اثرات جو بیان کیا ہے جن کے باعث تارکین کی زندگیوں کی جمی جمائی بساط الٹ گئی اور وہ بے شناختی کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں اور ان کے معاشی، نفسیاتی تہذیبی اور سب سے اہم شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ مصنفہ کا یہ ناول

ہر لحاظ سے ناول نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

ناول کا پلاٹ جدت کا حامل، دلچسپ کہانی، انوکھے دلچسپ اور باربط واقعات، عمدہ جزئیات نگاری، زبان و بیان کی سادگی اور چاشنی، دیگر زبانوں کے لفظیات کا موقع کی مناسبت سے مکمل اعتماد کے ساتھ استعمال مصنفہ کی فکری و فنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں مصنفہ کی باریک بینی، وسیع مطالعہ، مشاہدات، محسوسات، احساسات و خیالات کی ترجمانی اور تخیلات کی فراوانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مصنفہ ترک وطنی کے تجربات سے گزری ہیں۔ اس لیے وہ تارکین کے مسائل کا ادراک رکھتی ہیں۔ ناول کا پلاٹ آغاز سے وسط اور وسط سے اختتام تک دلچسپ تجسس آمیز اور مربوط ہے۔ اس کی کہانی قاری کی انگلی پکڑ کر امریکی سرزمین پر لے جاتی ہے اور وہاں دو بڑے المیوں کو پیش کرتی ہے جن کے باعث تارکین کی شناخت مشکوک ہو جاتی ہے۔ مسلمان تارکین میں امریکہ میں گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد درپیش مسائل خوف، بے بسی، کرب، عدم شناخت کا مسئلہ، مایوسی، اجنبیت، تنہائی کا احساس ہر کردار میں پنپتا ہے۔ جو انھیں اپنی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے آخر میری شناخت کیا ہے؟

اردو ناول کی روایت میں یہ ایک دلچسپ اضافہ ہے جس میں امریکی سرزمین پر تارکین کے مستقبل سے متعلق خدشات میں جھانکتے ہوئے حال کی بے شناختی، بے سروسامانی، انتقامی اور نفرت انگیز جذبات، تعصبات و اختلافات، دہشت گردی، سیاسی و سماجی احوال کو بیان کرتی ہیں۔ ناول کا موضوع انتہائی اہم اور متنوع جہات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس تحقیقی مقالے میں گیارہ ستمبر کی دہشت گردی اور گیانا المیے کے بعد سیاسی و سماجی پس منظر میں تارکین کے شناختی المیے کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ تہذیبی و ثقافتی ٹکراؤ کے نتیجے میں شناختی بحران کیسے پیدا ہوتا ہے ۔ اور مصنفہ نے تارکین کرداروں اور ان کی اولادوں کے ذریعے شناختی بحران کو پیش کیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے سانحے نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ خاص طور پر مسلمان ممالک اور بالخصوص امریکہ میں بسنے والے تارکین کی زندگیاں شدید متاثر ہوئیں ہیں۔

کتابیات

کتابیات

احمد،انوار۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۷ء۔

اقبال،طاہرہ۔پاکستانی اردو افسانہ سیاسی ، تاریخی پس منظر میں۔لاہور:فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔

احمد خان،ممتاز۔آزادی کے بعد اردو ناول ہیت،اسالیب اور رجحانات۔کراچی:انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۸ء۔

الشان صدیقی، عظیم۔اردو ناول آغاز و ارتقاء۔دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء۔

احمد خان،ممتاز۔اردو ناول کے چند اہم زاویے۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۰۳ء۔

احمد خان،ممتاز۔اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۲ء۔

امین،محمد۔اِسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش ایک تجزیہ،ایک مطالعہ۔لاہور:کتاب محل،۲۰۱۸ء۔

اعجاز،ملک۔پاکستان میں شناخت کا بحران۔ملتان:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔

اعجاز،احمد۔شناخت کا بحران۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۷ء۔

اختر،سلیم۔ادب اور کلچر۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء۔

بشیر،نیلم احمد۔طاؤس فقط رنگ۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء۔

بشیر،نیلم احمد۔راقمہ سے برائے راست انٹرویو۔ لوک ورثہ اسلام آباد:۱۷فروری۲۰۱۹ء۔دوپہر ۱:۳۵۔

بشیر،نیلم احمد۔ستمگر۔ستمبر۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء۔

بیگ،مرزااطہر۔غلام باغ۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء۔

برگس یوسا،ماریو۔نوجوان ناول نگار کے نام خط۔مترجم محمد میمن۔کراچی:شہرزاد پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء۔

پی ہنٹنگٹن، سیموئل۔تہذیبوں کا تصادم۔مترجم محمد حسن بٹ۔،لاہور:نگارشات پبلشرز،۲۰۱۹ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔راکھ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

تارڑ،مستنصر حسین۔خس و خاشاک زمانے۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔

تصدیق حسین،راجہ۔اسلام اور دہشت گردی۔لاہور:فن پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء۔

تارڑ،مستنصر حسین۔قلعہ جنگی۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء۔

تالیف اکبر احمد، برائن فورسٹ۔دہشت کے بعد۔مترجم ایم وسیم۔لاہور: مشعل پبلشرز، ۲۰۰۵ء۔
ثوبیہ منظور۔نیلم احمد بشیر کی ادبی خدمات۔مقالہ برائے ایم فل۔اورینٹل کالج۔پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء۔
جاوید، قاضی۔تاریخ اور تہذیب۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔
جنگ سنڈے میگزین۔۱۱ ستمبر۔۲۰۰۱ء۔
جاوید، صبا۔اردو ناول اور پاکستان۔راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔
چومسکی، نوم۔گیارہ ستمبر۔مترجم سید کاشف رضا۔کراچی: دی سمیع سنز پرنٹرز، ۲۰۰۲ء۔
چومسکی، نوم۔ریاستی دہشت گردی۔مترجم اعجاز بٹ۔لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۰۹ء۔
حیدر، قرۃ العین۔گردش رنگ چمن۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء۔
حسین، عبداللہ۔اداس نسلیں۔سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔
حیدر، قراۃ العین۔آگ کا دریا۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء۔
خورشید احمد، پروفیسر۔مسلم دنیا کی بے اطمینانی ۱۱ستمبر سے پہلے اور بعد۔اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی، ۲۰۰۵ء۔
خالد اشرف۔برصغیر میں اردو ناول۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔
درانی، عطش۔اسلامی فکر اور ثقافت۔لاہور: کتبہ عالیہ، ۱۹۸۰ء۔
رشید۔احمد۔امریکہ کی بدعہدی افغانستان،پاکستان اور وسطی ایشیا میں انتشار۔شفقت تنویر مرزا (مترجم) لاہور: وین گارڈ بکس، ۲۰۰۹ء۔
سیال دین، چوہدری۔انتہا پسندی کا سدا باب۔جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۰۸ء۔
سہیل گوہندی، فرخ۔غیر مقدس جنگیں۔لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۱ء۔
سلطان، روبینہ۔تین نئے ناول نگار۔لاہور: عدنان اشرف پرنٹرز، ۲۰۱۲ء۔
سٹیونز، انتھونی۔دہشت گردی کی نفسیات۔مترجم جواد۔لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۵ء۔
سعید، ایڈورڈ۔شرق شناسی۔مترجم محمد عباس۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔
سعید، ایڈورڈ۔ثقافت اور سامراج۔مترجم یاسر جواد۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء۔
سپیرو، ہیری۔ثقافت کا مسئلہ۔مترجم سید قاسم محمود۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء۔
صدیقی، اشرف کمال۔بحرانوں کا سفر۔اسلام آباد: منزل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

عارف، نجیبہ۔ ۱۱/ ۹اور پاکستانی اردو افسانہ:سیاسی و تاریخی پس منظر میں۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۱ء۔
عباس حسنی، علی۔ناول اور ناول نگار۔ملتان:کاروان ادب،۱۹۹۰ء۔
علی، مبارک۔غلامی اور نسل پرستی۔لاہور:تاریخ پبلکیشنز،۲۰۱۷ء۔
عارف، محمد۔اردو ناول اور آزادی کے تصورات۔لاہور:پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی،۲۰۱۱ء۔
عابد علی عابد،سید۔اسلوب۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء۔
عبدالناصر۔نیلم احمد بشیر بطور افسانہ نگار۔مقالہ برائے ایم فل۔لاہور:سرگودھا کیمپس،لاہور،۲۰۱۶ء۔
عارف، نجیبہ۔"ادب کا مزاحمتی رجحان پاکستانی اردو افسانہ پر ۱۱ / ۹ کے اثرات"۔مشمولہ معیار،اسلام آباد:بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء۔
فتح پوری، فرمان۔اردو نثر کا فنی ارتقاء۔لاہور:مثال پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء۔
فاروق،احمد۔اردو ناول میں مسلم ثقافت۔لاہور:المطبع العربیہ،۲۰۰۲ء۔
قدسیہ۔بانو۔حاصل گھاٹ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء۔
کاظمی، معظم۔سامراج اور دہشت گردی۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۶ء۔
لطیف،شاہدہ۔امریکہ،اسلام اور عالمی امن۔لاہور:حیدر پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء۔
محمد قیوم، شیخ۔امریکہ میں دہشت گردی اور افغانستان۔لاہور:جی ایف ایچ پبلیشرز،۲۰۰۲ء۔
محمدانی، محمود۔اچھا مسلمان برا مسلمان۔(مترجمین) سہیل ہاشمی، قمر آزاد ہاشمی۔اسلام آباد:دین گارڈین،۲۰۱۱ء۔
یسین، محمد۔ناول کا فن اور نظریہ فن۔لاہور:دارالنوادر پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء۔

Internet resources:

https://dictionary.cambridge.org/us/dictionary/english/identity-crisis
https ://www.oxfordlearnersdictionaries.com
https ://dictionary.cambridge.org/us/dictionary/english/identity-crisis
https ://www. dictionary.com/browse/identity-crisis
https ://www.collinsdictionary.com/us/dictionary/english/identity-crisis

https ://www. merriam-webster.com/dictionary/identity crisis
https ://en.wikipedia.org/wiki/Erik _Erikson
https ://www.aikrozab.com
https://. www.humsub.com.pk
www.facebook.com , Munir Ahmad

International Islamic Univ.

آمنہ بی بی محترمہ نیلم احمد بشیر سے انٹرویو لیتے ہوئے ۔ ۷ افروری۲۰۱۹ء